اُردو نظم پر دہشت گردی کے اثرات

(2000ء تا 2017ء)

مقالہ برائے ایم فل اُردو

مقالہ نگار:

محمد بشارت

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جولائی 2018ء

©

اُردو نظم پر دہشت گردی کے اثرات

(۲۰۰۱ء تا ۲۰۱۰ء)

مقالہ برائے ایم فل اُردو

مقالہ نگار:

محمد بشارت

یہ مقالہ

ایم۔فل (اُردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگوئجز

(اُردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

جولائی ۲۰۱۱ء

©

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیرِ دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگوئجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: اُردو نظم پر دہشت گردی کے اثرات

(تا ء)

پیش کار: محمد بشارت رجسٹریشن نمبر:1108/M/U/F15

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: شعبہ زبان و ادب اُردو

ڈاکٹر نعیم مظہر _____

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیر اعوان _____

ڈین فیکلٹی آف لینگوئجز

بریگیڈیئر محمد ابراہیم _____

ڈائریکٹر جنرل

_____

تاریخ

اقرار نامہ

میں محمد بشارت حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اِس مقالے میں پیش کیا گیا مواد میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز اسلام آباد کے ایم۔فل سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر نعیم مظہر کے زیر نگرانی مکمل کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا اِدارے میں ڈگری کے حصول کے لئے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گا۔

محمد بشارت

مقالہ نگار

فہرست ابواب

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم		iii
اقرار نامہ		iv
فہرست ابواب		v
مقالے کا دائرہ کار		vii
Abstract		viii
مقالے کا مقصد		ix
اظہارِ تشکر		x
باب اوّل:	پاکستان میں دہشت گردی کا سیاسی اور سماجی پس منظر	1
	(الف) دہشت گردی کے لغوی معنی اور تعریف	1
	- دہشت گردی کی تاریخ اور اقسام	4
	(ب) پاکستان میں دہشت گردی کے مسائل کا تجزیہ، عالمی تناظر میں	16
	(ج) اُردو ادب میں دہشت گردی کے اثرات بلحاظ موضوع	19
	ناول، افسانہ، غزل، نظم	19
	حوالہ جات	27
باب دوم:	اُردو نظم پر دہشت گردی کے اثرات بلحاظ موضوعات	29
	(الف) اُردو نظم میں دہشت گردی کے موضوع کی پیشکش	29
	(ب) نظم کے موضوعات میں تنوع	31
	(ج) انفرادی و اجتماعی دُکھ	35
	(د) اِدارے	46
	(ھ) فضا اور ماحول	52
	(و) ردِ عمل	56

حوالہ جات 62

باب سوم: اُردو نظم پر دہشت گردی کے اثرات بلحاظ اصنافِ نظم 64

(الف) بچوں کی نظمیں 64

(ب) دُعائیہ نظمیں 73

(ج) قومی نظمیں 77

- ملی ترانے/گیت 79

(د) شہر آشوب 83

(ھ) قطعات 89

(و) آزاد/نثری نظمیں

96

حوالہ جات 99

باب چہارم: اُردو نظم کے فن اور تکنیک پر دہشت گردی کے اثرات 102

(الف) علامات 104

(ب) اصطلاحات 108

(ج) تشبیہات واستعارات 113

(د) ہیت اور اسلوب کے نئے تجربات 117

حوالہ جات 121

باب پنجم: محاکمہ 123

(الف) مجموعی جائزہ 123

(ب) نتائج 128

(ج) سفارشات 129

کتابیات 131

مقالے کا دائرہ کار

میری تحقیق کا عنوان "اُردو نظم پر دہشت گردی کے اثرات"(2000ء تا2017ء) ہے۔ میں نے اپنے مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

پہلے باب میں دہشت گردی کی تعریف، تاریخ، اقسام اور پاکستان میں دہشت گردی کے مسائل کا عالمی تناظر میں تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اصنافِ ادب، ناول، افسانہ، غزل اور نظم میں دہشت گردی کی وجہ سے پڑنے والے اثرات کو موضوعات کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔

دوسرے باب میں اُردو نظم میں دہشت گردی کے موضوع کی پیش کش کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے اور اُردو نظم کے موضوع کے تنوع کو پیش کر کے اُردو نظم میں دہشت گردی کے پیش نظر آنے والے انفرادی و اجتماعی دُکھ اِداروں کی صورتِ حال، فضا و ماحول اور اس موضوع کے تحت نظم میں بیان ہونے والے ردِ عمل کو بیان کیا گیا ہے۔

تیسرے باب میں اُردو نظم کی مختلف اصناف پر دہشت گردی سے پڑنے والے اثرات کو بیان کیا گیا ہے اور بچوں کی نظموں، دُعائیہ اور قومی نظموں، ملی ترانوں، شہر آشوب، قطعات، آزاد اور نثری نظموں میں برتے جانے والے موضوعات کو شامل بحث کیا گیا ہے۔

چوتھے باب میں اُردو نظم کے فن اور تکنیک پر دہشت گردی کے اثرات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ نظم کے اسلوب میں ہونے والی تبدیلیوں کو علامات اور اصطلاحات کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ موضوع کے تحت اُردو نظم میں تشبیہ و استعارہ میں ہونے والی تبدیلیوں کو پیش کیا گیا ہے اور ہیت اور اسلوب کی نئی جہات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔

پانچواں باب تحقیق کا ماحصل ہے۔ اس باب میں مجموعی جائزہ پیش کیا گیا ہے اور اُن تمام نکات پر روشنی ڈالی گئی ہے جنھوں نے جدید نظم کو دہشت گردی کے حوالے سے نئے خیالات، موضوعات اور فنی نُدرت بخشی ہے اور باب کے آخر میں تحقیق کے دوران سامنے آنے والی سفارشات کو پیش کیا گیا ہے۔

ABSTRACT

"Poem in Urdu" wanders here and there in the environmental outskirts in search of its topics and having found its jewel, a poet with sensitive mind, with his poetic attitude and aptitude, and choice of words, finds such topics with whose embellished use provides his reader and critic with ample material. Our society has been facing terrorism for decades. In such an environment, poetic figminations and angles find new horizons.

Urdu – particularly poem in Urdu evolved in atmosphere of tyranny, terror, frightfulness, the poets, at topic level and with choice of words have excelled this in a decorated manner and have tried to abolish the atmosphere of horror and terror and have brought ease and comfort to the society. To revive this comfort and peace, the poets of poem in Urdu have used various narratives, different steps and angles of this narrative is the prime purpose of this research.

مقالے کا مقصد

اُردو نظم اپنے موضوعات کی تلاش میں اِرد گرد کے فضا میں پھرتی ہے اور پھر وہ اپنے گہر نامدار کو تلاش کر لیتی ہے۔ایسے میں اس حساس ذہن کا مالک یعنی شاعر اپنے شعری برتاؤ اور الفاظ کے چناؤ سے موضوعات کو احسن طریقے سے برت کر قاری اور تنقید نگار کی فکر اور سوچ کے لئے مواد مہیا کرتا ہے۔

ہمارے معاشرے کو مسلسل دہشت گردی کا سامنا ہے۔ ایسے ماحول میں شاعری کی تخلیقات بالخصوص نظم کو نئے زاویے اور نئے پیرائے ملتے ہیں۔ اُردو نظم کو ان تقاضوں اور جبر، دہشت اور وحشت کے ماحول میں پروان چڑھاتے ہوئے شعرا نے موضوعاتی سطح پر الفاظ کے انتخاب اور چناؤ کو خوش اسلوبی کے ساتھ آگے بڑھایا ہے اور اس دہشت و وحشت کی فضا کو ختم کرنے اور معاشرے کے امن و سکون کو بحال کرنے کے لئے نظم کے شعرا نے جو بیانیہ استعمال کیا اور اُردو نظم کے موضوعات کو جس انداز میں وسعت دی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ بدلتے ہوئے حالات اور فضا میں سوچ اور خیال کے جو زاویے منعکس کیے ہیں اسی بیانیے کے مختلف مدارج اور زاویوں کی کھوج اس تحقیق کا بنیادی مقصد ہے۔

اظہارِ تشکر

میں خدائے بزرگ و برتر کے جملہ احسانات کا اقرار کرتے ہوئے اپنے والدین بالخصوص والدِ بزرگوار مرحوم کا ممنون ہوں جن کی رہنمائی، حوصلہ افزائی اور دُعاؤں نے ہر پل میرا ساتھ دیا۔

اس کے علاوہ صدر شعبہ اُردو پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شہناز صاحبہ اور رابطہ کار ایم فل / پی ایچ ڈی کورس ڈاکٹر فوزیہ اسلم صاحبہ کا شکر گزار ہوں جن کی اعانت میرے لیے بطور شفیق اُستاد رہی۔

جملہ اسٹاف شعبہ اُردو کا شکر گزار ہونے کے ساتھ ساتھ میں نگران مقالہ ڈاکٹر نعیم مظہر کا بھی مشکور ہوں جنھوں نے ہر لمحہ میری ہمت بندھائی اور رہنمائی کرتے رہے۔

میں رفیقِ کار راجہ قیصر آفتاب کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے کُتب کی فراہمی اور مواد کی دستیابی میں میری اعانت کی۔

اس کے علاوہ اُن تمام لوگوں کا شکریہ جو اس تحقیق کی تکمیل میں میرے ہمراہ رہے۔

محمد بشارت

باب اوّل:　"پاکستان میں دہشت گردی کا سیاسی و سماجی پس منظر"

دہشت گردی کے لُغوی معنی اور تعریف:

ترکیب "دہشت گردی" جو فی زمانہ ایک معروف اصطلاح کے طور پر سامنے آئی ہے اور جو تقریباً زبانِ زدِعام ہو چکی ہے؛ کی لغوی تحقیق کرنے سے درج ذیل معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

لغت میں دہشت کا مطلب ہے "خوف و ہراس پھیلانا"۔ عربی میں اس کے لئے "تصلب" کا لفظ مستعمل ہے۔ جس کے معنی "تشدد، طاقت ور بننے اور سختی" کے ہیں۔ تاہم اُردو زبان میں رائج ایک لفظ "رعب" بھی اس کے قریب قریب ہے۔ انگریزی زبان میں دہشت کے لئے لفظ "Terror" کا لفظ معروف ہے جس کا مفہوم یہ ہے "دہشت گردی کے بعد معاشرے میں پیدا ہونے والی خوف و ہراس کی کیفیت"۔

اسی طرح لاطینی زبان میں یہ لفظ 'Terrere' ہے۔ جبکہ فرانسیسی زبان میں پہلے پہل اس کا تلفظ 'Terrour' تھا جو بعد ازاں معمولی سی تبدیلی کے ساتھ 'Terrur' ہوا۔

مستعمل اصطلاح "دہشت گردی" میں لفظ "دہشت" کے ساتھ، جس کی توضیح مختصراً بیان کی جا چکی ہے، "گردی" کا لفظ بطور لاحقہ استعمال کیا جاتا ہے۔ چونکہ گرد کے معانی خاک کے ہیں۔ لہٰذا مرکب لفظ دہشت گردی کا لغوی مفہوم یوں بنتا ہے کہ جس طرح گرد [خاک] کی خصوصیت یا سرشت میں یہ بات شامل ہے کہ اس کو ہوا کا تھوڑا بہت اِشارہ یا جھونکا ملتے ہی یہ فضا میں پھیل جاتی ہے، عین اسی طرح دہشت گردی میں بھی خوف، ڈر اور ہراس فضا و ماحول میں بہت تیزی سے پھیل جاتا ہے۔

اردو زبان میں لفظ دہشت گردی کے یہی معانی و مفاہیم مشہور و معروف ہیں۔ یعنی "خوف و ہراس پھیلانا"۔ جبکہ اسکے ساتھ ملتے جلتے مطالب میں 'خوف و خطر کی کیفیت کو پھیلانا، بے چینی اَور عدم اطمینان والی کیفیت میں اضافہ کرنا، خوف و ہراس کو بڑھانا، تشدد اَور دھمکیوں کا استعمال کرنا اَور اِس طرح کے دیگر الفاظ و تراکیب شامل ہیں۔

دہشت گردی کی تعریف کے حوالے سے کوئی ایک عالمگیر اور متفقہ تعریف پر تا حال اتفاق رائے قائم نہ ہو سکا ہے تاہم ہر ایک نے اپنے اپنے نقطہ نظر کے حوالے سے مختلف آرا پیش کی ہیں۔ دراصل یہ ایک متعلقہ اصطلاح (Relative Term) ہے لہٰذا اہلِ مشرق کے نزدیک جن الفاظ و انداز میں دہشت گردی کی

واضح تعریف ہونی چاہیئے وہ باشندگانِ مغرب کے لئے قابلِ قبول نہیں۔ یہی حال دائیں اور بائیں بازو کے مکتبہ فکر کا بھی ہے اَور یہی نظریہ وخیال مذہبی اَور سیکولر طبقے پر بھی لاگو کیا جاسکتا ہے کیونکہ ہر طبقہ اس کو اپنے اپنے حوالوں سے دیکھتا اَور پرکھتا ہے۔

تاہم سطور ذیل میں اردو اَور انگریزی زبان کے چند اہم اصطلاحی مفاہیم اَور تعریفات درج کی جاتی ہیں جن سے توضیحی طور پر دہشت گردی کے مفہوم کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

رابطہ عالمِ اسلامی کے سولہویں سیشن کے بعد "دہشت گردی، اعلامیہ مکہ" (Makkah Declaration) کے نام سے جو اعلامیہ جاری ہوا اس میں دہشت گردی کی تعریف یوں کی گئی:

> "دہشت گردی سے مُراد وہ سرکشی ہے جس کا ارتکاب مخصوص افراد، جماعتیں یا ملک دوسرے انسانوں کے دین، خون، عقل، مال اَور عزت کی پامالی کے ذریعے کرتے ہیں۔ اس ظلم اَور حقوق کی پامالی میں ایذا رسانی، خوف وہراس پیدا کرنا اَور ناحق قتل کرنا شامل ہے۔ اسی طرح گروہوں کی شکل میں لوٹ مار، خون خرابہ، اور شاہراہوں پر قبضہ کرکے لوگوں کو ہراساں کرنا بھی اسی نوعیت کے جرائم ہیں"۔

ایک اَور تعریف کی رُو سے:

> **It is the unlawful use of force and violence against personnel and property by an individual, group, community or a state for intimating the opposition for political, social, ethnic, economic and religious purposes.**

اُردو انسائیکلوپیڈیا مطبوعہ فیروز سنز لاہور کے مطابق:

> سیاسی مقاصد کے حصول اَور سیاسی نظام کو تباہ کرنے کے لئے متشددانہ کارروائیاں کرنے کا نام دہشت گردی ہے۔

آکسفورڈ انسائیکلوپیڈیا کے مطابق:

Terrorism is a deliberate, unjustifiable and random use of violence for political ends against protected persons.

دہشت گردی کے حوالے سے اعجاز ملک رقمطراز ہیں:

"دہشت گردی کی تعریف کا مسئلہ بہت الجھا ہوا ہے تاہم جب کسی بھی نوعیت کے مقاصد کے حصول کے لئے تشدد کا راستہ اختیار کیا جائے تو یہ دہشت گردی ہے۔ مزید یہ کہ ڈرانا، دھمکانا اَور خوف کی فضا قائم کیے رکھنا بھی دہشت گردی ہے"۔

مصطفیٰ اکیول کے مطابق:

"دشمن کے غیر لڑاکا لوگوں کو شعوری طور پر نشانہ لگا کے مارنے کو دہشت گردی کہتے ہیں"۔

نامور مفکر اور دانشور چومسکی کے مطابق:

"دہشت گردی تشدد یا اس دھمکی کا نپا تلُا استعمال جو دباؤ ڈال کر اَور خوف و جبر پیدا کر کے سیاسی مذہبی یا نظریاتی نوعیت کے اہداف حاصل کرنے کے لئے کیا جائے۔

مندرجہ بالا تمام تعریفات میں تمام مفکرین اس بات پر متفق ہیں کہ دہشت گردی کی کارروائیاں سیاسی، مذہبی، نظریاتی اَور دیگر خصوصی مقاصد کے لئے کی جاتی ہیں اَور ان تمام کارروائیوں میں تشدد کا عنصر کار فرما ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ اس قسم کی کارروائیوں کا مقصد خوف اور ہراس کی فضا کو قائم کرنا ہوتا ہے تاکہ مقاصد کے حصّول پر رکاوٹ ڈالنے والے عناصر پر دباو ڈالا جاسکے۔

امجد طفیل اس ضمن میں لکھتے ہیں:

دہشت گردی کی تعریف میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس میں سیاسی تبدیلی کے لئے لوگوں کو خوفزدہ کیا جاتا ہے۔ تاکہ مقاصد کا حصول آسان ہو جائے۔ دہشت گردی کی تمام کارروائیوں میں تشدد یا اس ممکنہ استعمال کی دھمکی کار فرما

ہوتی ہے۔

ذیل میں دی گئی انگریزی تعریف سے بھی لفظ دہشت گردی کے پیچھے کیا عوامل کار فرما ہوتے ہیں واضح ہوتا ہے۔

Terrorism is sustained, clandestine use of violence, including murder, Kidnapping, Hijacking; to achieve a political purpose in popular usage, However as influence by politicians and the media.

دہشت گردی کی تاریخ اور اقسام:

دہشت گردی کی تعریف کی طرح اس کی تاریخ پر بھی تمام مفکرین اَور محققین کی کوئی متفقہ رائے دستیاب نہیں۔ بلکہ اس ضمن میں مختلف اُدوار کے اندر دہشت گردی کے آغاز اَور بتدریج ارتقا سے متعلق کئی آرا ملتی ہیں.

اسلامی نقطہء نظر کے حامی محققین دہشت گردی کے آغاز کو خلیفہ سوم حضرت عثمان غنی کے قتل سے تعبیر کرتے ہیں جس کی بنیاد سیاسی اَور حکومتی اقتدار کا حصول تھی۔ مزید براں حضرت علی خلیفہ چہارم اور بعد ازاں ان کی اولاد کا کربلا کے مقام پر قتل دہشت گردی کے اہم ترین واقعات ہیں۔

روحانیت کے قائل خدا اَور شیطان کی جنگ کو ہی جو کہ دراصل "طاقت ور / قادر مطلق" رہنے کی غرض سے ہی ہوئی اس کا آغاز اور منبع قرار دیتے ہیں۔

دنیا میں پہلا دہشت گردی کا واقعہ دو بھائیوں ہابیل اور قابیل کے درمیان پیش آیا جو خون ریزی پر اختتام پذیر ہوا۔ اگرچہ اس کے مقاصد سیاسی نہ تھے تاہم انسان اس دنیا میں کشت و خون کا باعث بنا اَور مقاصد کے حصّول میں خوف کی بنیاد پڑی، دہشت کو بطور ہتھیار استعمال کیا گیا۔

جدید ادوار تک پہنچتے پہنچتے دہشت گردی کے تانے بانے انقلاب فرانس سے ملائے جاتے ہیں۔ ایک رائے کے مطابق:

> جدید تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ دہشت گردی کی اصطلاح نے سب سے پہلے انقلابِ فرانس کے دوران جنم لیا۔ اس انقلاب کے دوران دہشت گردی کو سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔

یعنی تحقیق کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ خالصتاً کوئی جدیدیت یا مابعد جدیدیت کی پیداوار نہیں بلکہ اس کے تانے بانے انقلابِ فرانس سے ملتے ہیں۔ اس کا ثبوت ہمیں انسائیکلوپیڈیا آف امریکانا میں ملتا ہے۔ اس انسائیکلوپیڈیا کے مرتبین رقم طراز ہیں:

The term originated as description of the Reign of terror (1793-94) during the French Revolution. In the late 19th century the terrorism was turned against the state.

اِسی طرح دی ورلڈ بک آف انسائیکلوپیڈیا میں رقم ہے:

"The word 'Terrorism' first appeared during the French revolution (1787 – 1799) some of the revolutionaries who seized power in French violently attacked their enemies. The period became known as the reign of Terror".

جبکہ ایک اَور دستاویز کی رو سے دہشت گردی کی تاریخ کے متعلق یہ وضاحت ملتی ہے:

"Terrorist tactics have been used for centuries. An American group, the "KU KLUX Klan", used violence to terrorize blacks and their sympathizers in the late 1800's and the 1900's".

دراصل انقلاب فرانس[1793-94] کے دوران ایک تحریک کی کارروائیوں سے باقاعدہ و باضابطہ طور پر دہشت گردی کا آغاز ہوا جس کا نام "REGIME DE LA TERRUR" تھا۔ اس کے بعد 1798 میں پہلی مرتبہ دہشت گردی کا اصطلاحی لفظ فرانسسی ڈکشنری "Dectionarie of Academic Franeaise" شامل کیا گیا۔ اور دہشت گردی کو مجرمانہ سرگرمیوں کے لئے استعمال کیا جانے لگا۔ اَور آج تک یہ لفظ کم و بیش انہی منفی اور اسی طرح کے دیگر مفاہم میں مستعمل ہے۔

اگر دہشت گردی کی تاریخ کا مزید جائزہ لیا جائے تو جو دلچسپ اَور حیرت انگیز معلومات یا حقائق سامنے آتے ہیں ان سے بھی دہشت گردی کا تاریخی پس منظر جاننے میں اور ایک مخصوص فہم تک رسائی حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے۔

جیوش انسائیکلوپیڈیا کی ویب سائیٹ دہشت گردی کے تاریخی پس منظر میں اس کی ابتدا ایک یہودی فرقے سے منسلک کی جاتی ہے جس کو "سیکاری" کہا جاتا تھا۔ یہ فرقہ سرزمینِ فلسطین پر 📄📄ء میں نمودار ہوا۔ یہ ایک انتہائی مذہبی گروہ تھا۔ جس میں نچلے طبقے کے لوگ شامل تھے جو دراصل فلسطین میں یہودیت کے فروغ کے لئے معرض وجود میں آیا تھا۔ اس فرقے نے جو طریقہ کار اپنایا اس کی بنیاد پر سلطنتِ روم نے ان کو دہشت گرد قرار دیا۔

اسی طرح تاریخ میں گیارہویں صدی عیسوی میں اسماعیلی فرقے کی ایک شاخ "حشاشین"[Assassins] نے اپنے مذہبی اور سیاسی مشترکہ مقاصد کے حصّول کے لئے دہشت گردی کا سہارا لیا۔

یہاں یہ بات ایک حیران کن اِتفاق کے طور پر سامنے آتی ہے کہ اسماعیلی فرقے کی اِس دہشت پسند شاخ کا طریقہء قتل اور موجودہ خودکش بمباروں کا طریقہء قتل اپنے اندر ایک مماثلت اختیار کیے ہوئے ہے۔ کہتے ہیں اِس جماعت کے فدائی دشمنوں کو خفیہ طور پر خنجروں سے ہلاک کرتے تھے اور حسن بن صباح اپنے فدائیوں کو حشیش کے ذریعے غنودگی طاری کر کے اس کام پر اُکساتا تھا۔ دورِ حاضر میں بھی خودکش بمباروں کی تیاری کے بارے میں یہ رائے پیش کی جاتی ہے کہ اُن کے ذہن کو جدید نفسیاتی اور سائنسی طریقوں کے استعمال مثلاً ٹیلی پیتھی، ہپناٹزم کے ذریعے سلب یا ماؤف کر کے خودکش بمباروں کو اُن کے جسم کے ساتھ بندھے ہوئے دھماکہ خیز مواد کو پھاڑنے پر مجبور کیا جاتا ہے جو خود اُن کی اَور اس کے ساتھ دیگر بے گناہ افراد کی جانوں کے قتل کا باعث بنتا ہے۔ وِکی پیڈیا میں تحریر ہے:

> کہا جاتا ہے کہ اِس جماعت کے فدائین (اگر انہیں خودکش حملہ آور کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا) ہمیشہ زہر آلود خنجر سے مسلح رہتے تھے۔ چنانچہ اِن کا شکار معمولی سا زخمی ہونے کی صورت میں بھی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا اَور حملہ آور گرفتاری سے بچنے کے لئے اِسی زہریلے خنجر سے خود کشی کر لیتا۔ 🖱️🗁

اس طرح کے دیگر کئی چھوٹے بڑے واقعات تاریخ میں مختلف علاقوں، مذاہب، فرقوں، ریاستوں یا گروہوں سے منسوب ملتے ہیں۔ جو اس دہشت گردی کی توضیح اور تاریخ کا ادراک کرنے میں بھی معاون ہیں تاہم تیرھویں صدی کے بعد اٹھارہویں صدی تک دہشت گردی کی کوئی بڑی اور قابلِ ذکر کارروائی تاریخ میں رقم نہیں البتہ یورپ میں چھوٹی چھوٹی دہشت گردی کی کارروائیاں بادشاہوں کی مخالفت میں بغاوتوں کے زمرے میں نظر آتی ہیں۔

دہشت گردی کی تاریخ اَور تاریخی پس منظر کی تحقیق کے دوران یہ دلچسپ اور حیران کن انکشاف بھی سامنے آتا ہے کہ 1796 میں پہلی مرتبہ "Terror" بمعنی "دہشت" کا لفظ لغات یعنی ڈکشنری میں شامل کیا گیا۔ تو اس لفظ کو مثبت اور مثبت کارروائی کے طور پر لیا گیا۔ تاہم فرانس کی دوسری ڈکشنری جب مرتب ہوئی تو اس میں Terror کے لفظ کو منفی دہشت گردی، یا منفی مقاصد کے لئے حصول کے لئے دہشت گردی کے معنوں میں سمجھا گیا۔ اور اس کے بعد آج تک یہ لفظ اپنی پوری شد و مد کے ساتھ انہی مفاہیم میں مستعمل ہے۔

عالمی سطح پر دہشت گردی کے واقعات میں تیزی بیسویں صدی کے آغاز سے تاحال دیکھنے میں آتی ہے۔ جس کا ایک بڑا مقصد بڑی طاقتوں کا عالمی، تجارتی، منڈی میں اجارہ داری قائم کرنا اور پسماندہ اور چھوٹے ممالک کو بھاری قرضوں کے بوجھ تلے دبا کر بھاری سود دینے پر مجبور کرنا ہے۔ اور جب یہ ممالک اس مقصد میں ناکام ہو جائیں اور قرض کی ادائیگی بشمول سود نہ کر سکیں تو ان ممالک میں آمریت، فسطائیت قائم کر کے ایسے حکمران اُن پر مسلط کر دینا جو بڑی طاقتوں کے آلہ کار بن کر اپنے ممالک کے وسائل کو بآسانی بڑی طاقتوں کے حوالے کر دیں۔ یا ایسے ممالک جو بڑی طاقتوں کا آلہ کار بننے سے انکار کر دیں۔ ان پر فوجی تسلط، بربریت، جنگ، قتل و خون، خوف و ہراس دہشت گردی مسلط کر دینا تا کہ وہ بالآخر بڑی طاقتوں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو سکیں۔

یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کے اختتام اور اکیسویں صدی کے آغاز سے ہی پاکستان، عراق، افغانستان جو کہ دہشت گردی کے واقعات سے بالترتیب پہلے دوسرے اور تیسرے نمبر پر متاثرہ ممالک ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق 2009 تک بم دھماکوں، خودکش حملوں اور اسی طرح کے دیگر واقعات میں پوری دنیا میں ہونے والے واقعات میں 60 فیصد سے زیادہ متاثرہ ہیں۔ اور ان میں سے بھی

سب سے زیادہ پاکستان متاثرہ ممالک میں شمار کیا جاتا ہے جو 🕿🕭🗀🗀🗎 تک 🗐🗏 فیصد اور 🖮🗁🗀🗎 تک 🗁🗐 فیصد متاثرہ تھا۔

درج بالا توضیحات خصوصاً دہشت گردی کے مختلف تعریفات سے اور اختلاف آراسے جہاں دیگر معاملات پر روشنی پڑتی ہے تو ساتھ ہی اس کے متعدد اقسام پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ سطور ذیل میں چند اہم اقسام شامل کی جا تی ہیں۔

اردو انسائیکلوپیڈیا کے مطابق

دہشت گردی کے متعدد اقسام ہیں۔ تاہم ان میں
تشدد یا تشدد کا خطرہ مشترکہ عنصر کے طور پر پایا
جاتا ہے۔ 🕿🕭🗁

دراصل جب کسی ایک تعریف پر اتفاق رائے نہیں تو اس کالا محالہ یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اس (دہشت گردی) کی انواع بھی ایک سے بڑھ کر ہی ہوں گی۔ یہ الگ قضیہ ہے کہ بوجوہ ایک گروہ کے لئے تو وہ مقبول ہو گا، دوسرے کے لئے ناقابلِ قبول جبکہ تیسرے کے لئے جزوی مقبول۔ بالواسطہ (Indirect) طور پر اس کی وضاحت نیلسن منڈیلا کے اقوام متحدہ میں کی گئی تقریر کے اُس حصے سے ہو سکتی ہے جس میں انھوں نے کہا تھا کہ "میں ایک زمانے میں دہشت گرد تھا اور اس کے بعد سربراہِ مملکت"۔ اس حوالے سے ورلڈ انسائیکلوپیڈیا میں بھی رقم ہے کہ

> **Terrorists acts are committed for various reasons. Some individuals and groups that use terrorism support a particular philosophy. Other represent minority groups seeking liberation from govts. In power.**
> **Dictators and totalitarian govts also use violence to frighten or eliminate their opponents.** 🗎🗀

یہاں یہ بات بھی قابل تذکرہ ہے کہ عصر حاضر میں تقریباً ہر اجتماعی اہمیت کے حامل معاملے میں وسائل ذرائع ابلاغ (میڈیا) کا اس کے بناؤ یا بگاڑ ہر دو حوالوں سے اہم کردار رہتا ہے۔ اس سلسلے میں دہشت گردی کی اقسام

کے تناظر میں بھی یہ بات پوری طور پر صادق آتی ہے۔ کیونکہ "موجودہ دور میڈیا کا دور ہے اور غور کیا جائے تو محسوس ہو گا کہ مغرب محض موثر اور طاقتور میڈیا کے ذریعے ہمارے ذہنوں پر حکومت کر رہا ہے۔ مغربی میڈیا وقتاً فوقتاً نئے نئے شوشے چھوڑتا رہتا ہے۔ جس کا مقصد ہماری سوچ کو متاثر کرنا اور ہماری فکر ایک خاص رُخ پر ڈالنا ہوتا ہے۔

پس یہ اور اس قبیلہ کے دیگر متعلقہ اور نیم متعلقہ عوامل مل کر دہشت پسندی کی مختلف قسموں کو جنم دے کر اس کے بعد بڑھاوا بھی دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہر کوئی خاص ذہنیت کا حامل گروپ دہشت گردی کی ایک قسم کو اختیار کرے گا تو اس کے برعکس دوسرا کوئی گروہ اس سبب ذہنیت یا حالات کے تبدیلی کی وجہ سے دوسری قسم کی دہشت گردی میں ملوث ہو گا۔ بہر حال سطور ذیل میں چند مشہور اقسام درج کی جاتی ہیں۔

پروفیسر ایچ آئی کرمینن سٹروچ کے مطابق دہشت گردی کے معروف اقسام کچھ یوں ہیں:

ریاستی دہشت گردی دہشت گردی کی وہ قسم ہے جس میں دراصل مخالف (فریق) کو حقِ خود ارادیت سے محروم رکھنے کے لئے دہشت پر مبنی حربے اپنائے جاتے ہیں۔ جیسے کہ فی زمانہ امریکہ، اسرائیل اور ہندوستان کر رہے ہیں۔ جب کہ ماضی میں گسٹاپو، کے جی بی (KGB) اور سٹیٹ سائی اور ان جیسے اداروں کا ہم وطن نسلی اقلیتوں پر تشدد کرنا ریاستی دہشت گردی کی مثالیں ہیں۔

اصل میں ریاستی دہشت گردی کا اولین مقصد کسی بھی کمزور ملک میں اپنی حامی اور تابع فرمان حکومت کا قائم کرنا ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اسے کمزور خطے کے وسائل تک رسائی کو ممکن بنانا بھی ان کے مقاصد میں شامل ہوتا ہے۔ ریاست کی پشت پناہی میں ہونے والی دہشت گردی کا وجود اگرچہ کسی نہ کسی صورت میں صدیوں پرانا ہے۔ تاہم اس بارے میں بین الاقوامی برادری کی تشویش کا آغاز 🗀⌨🖲🗁 کی دہائی سے ہوا۔

عمرانی علوم کے ماہرین بخوبی جانتے ہیں کہ ریاست کی تشکیل، استحکام اور بقا میں قتل و غارت گری شامل ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ریاست نے انسانوں پر جتنے مظالم کیے ہیں۔ اتنے شاید افراد یا گروہوں نے نہ کیے ہوں۔ چونکہ ریاست کے پاس وسائل بے پناہ ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ ہمیشہ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے جارحانہ اور پر تشدد عزائم رکھتی ہے۔ غرض یہ تشدد پر مبنی عمل اور اس کے نتیجے میں بلاجواز حد سے زیادہ ردِ عمل اسی قسم کی دہشت گردی میں داخل ہے۔

فی زمانہ جہاں ضروریات اور کسی حد تک خواہشات بڑھنے کے نتیجے میں نت نئی ایجادات سامنے آرہی ہیں تو یقیناً اس کے ساتھ پیچیدگیاں بھی بڑھ گئی ہیں۔ جس کے مثبت اور منفی دونوں طرح کے اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ جس سے ثقافتی یلغار کے راستے ثقافتی دہشت گردی جنم لے رہی ہے۔

میڈیا(وسائل ذرائع ابلاغ) کے تمام تر وسائل یا اقسام [الیکٹرانک پرنٹ اور سوشل] کے ذریعے گمراہی پھیلانا، لغو، بے اصل، بے بنیاد اور غیر حقیقی الزامات سے اصلیت اور حقائق کو مسخ کرنے، توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی مذموم کوشش کرنا اس قسم کی دہشت گردی میں شامل ہے۔

ثقافتی دہشت گردی کے ذریعے اپنے مقاصد کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے برائی کی تشہیر کی جاتی ہے۔ اور اسے خوشنما بنا کر عوام میں رائج کرنے کی مذموم سعی کی جاتی ہے۔

دہشت گردی کی من جملہ دیگر اقسام میں سے ایک گلوبل دہشت گردی بھی شامل ہے۔ اس کا سب سے خطرناک پہلو اس کے نام سے ہی ظاہر ہے کہ یہ عالمی پیمانے پر مبنی دہشت گردی ہے۔ عرفان امتیازی نے نامور امریکی مفکر نوم چومسکی کے حوالے سے لکھا ہے کہ نوم چومسکی کے مطابق:

> امریکہ کی پالیسیوں اور نیو ورلڈ آرڈر کے حامیوں کی مخالفت کرنے والوں کو دہشت گرد بنانا امریکہ کا کھیل ہے"۔ گلوبل دہشت گردی آزاد جمہوریتوں کے لیے نہایت سنگین خطرہ ہے۔ 🗁🗎

دہشت گردی کی ایک اور قسم تکنیکی دہشت گردی ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہوتا ہے۔ دہشت گردی کی اس قسم کو دیگر تمام اقسام کے مقابلے میں نہایت تکنیکی طریقہ کار کے مطابق سرانجام دیا جاتا ہے۔

ملکی یا غیر ملکی مگر مطلوب افراد کو حبسِ بے جا میں رکھ کر مطالبات منوائے جانے کے مذموم مقاصد پایہ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ دہشت گردی کی اس قسم میں چند دیگر طریقہ ہائے کار بھی ہوتے ہیں۔ جن میں انفرادی تشدد برتا جاتا ہے۔

دہشت گردی کی ایک اور قسم سیاسی دہشت گردی بھی ہے۔ دہشت گردی کے اس نوع پر دو آرا ملتی ہیں۔ اولاً یہ کہ سیاسی، دہشت گردی اصل میں ریاستی دہشت گردی ہی کا ایک جزو ہے۔ دوم یہ جز نہیں بلکہ اپنی قسم کی ایک الگ نوع رکھتی ہے۔ جس کی تعریف یوں کی جاتی ہے کہ سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے تمام تر ناجائز ذرائع اختیار کرنا اور ان پر کلی یا جزوی انحصار کرنا اس قسم میں شامل ہے۔

در حقیقت اس قسم کی دہشت گردی میں ایک سیاسی فکر رکھنے والی جماعت دوسرے لوگوں کو اپنی سیاسی رائے کا پابند کرانے کی غیر فطری خواہش رکھتی ہے۔

سرکاری تعاون سے ہونے والی دہشت گردی بھی ایک دہشت گردی کی قسم ہے۔اس قسم کو ریاستی دہشت گردی اور سیاسی دہشت گردی دونوں سے الگ رکھا گیا ہے۔ کیونکہ ان تینوں میں فرق پایا جاتا ہے۔ اگرچہ بظاہر وہ بہت معمولی نظر آتا ہے۔ عرفان امتیازی اس کے خوفناک اثرات کے متعلق کہتے ہیں:

> دوسرے سرکاری تعاون سے ہونے والی دہشت گردی کے
> خطرات سے سب ہی بخوبی واقف ہیں جو حکومت اپنے خزانے،
> فوجی نظم وانصرام، سیاسی وسائل، تربیت اور مخبری کے
> ذریعے دہشت گردوں کی مدد کرتی ہے۔اور ان کے قوت
> ضرب کو بے پناہ بڑھاتی ہے۔ایسی دہشت گردی سے
> موجودہ نازک بین الاقوامی نظام کو جو نقصان پہنچا ہے۔وہ
> مزید تشویش کا باعث ہے۔📄📄

انفرادی دہشت گردی دہشت گردی کی وہ قسم ہے جس میں دہشت گردی ذاتی بدلے، انتقام یا ذہنی عدم توازن کے ساتھ ساتھ معاشی عدم اطمینان کا نتیجہ ہو سکتی ہے۔ مطلب یہ کہ کوئی بھی فرد معاشرے میں پائے جانے والی عدم توازن، لاقانونیت، حق تلفی اور کے حالات کے باعث ذہنی انتشار کا شکار ہو جاتا ہے اَور پھر انتہائی قدم اٹھانے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ ایسا قدم جو لامحالہ دہشت گردی کے زمرے میں ہی آتا ہے۔اگرچہ مذکورہ بالا دہشت گردی غیر ساز گار حالات کی وجہ سے ہی فرد کو پر تشدد راستہ اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہے مگر پھر بھی اس کا انفرادی طور پر یہ انتہائی قدم اُٹھانا دہشت گردی ہی کہلائے گا۔ ممکنہ طور پر بنیادی انسانی حقوق کی پامالی اور کمزور طبقہ پر ہونے والے مظالم اس قسم کی دہشت گردی کے اسباب بنتے ہیں۔

گروہی دہشت گردی دراصل انفرادی دہشت گردی کا عکس ہے۔یعنی اس قسم میں متعدد گروہی عوامل مثلاً مذہبی، نسلی اور سیاسی شامل ہوتے ہیں، اس کے نمائندے موجودہ دور میں سیکولر اور وہ طبقات ہیں جو کہ اسلام کے نظامِ حیات سے واقف نہیں ہے۔ اگر اُمتِ مسلمہ کا طرزِ حکومت شریعت پر قائم کر لیا جائے اور اختیار

متقی، پرہیز گار اور شریعت سے واقفیت رکھنے والوں کے پاس ہو تو یقیناً ہم مذہبی، انسانی، سیاسی اور ان تمام اقسام کی دہشت گردیوں سے بچ سکتے ہیں۔ جو گروہی دہشت گردی میں شامل ہیں۔

مذہبی دہشت گردی کو بھی دہشت گردی کی ایک قسم سمجھا جاتا ہے۔ دراصل کوئی بھی دہشت گردی مذہبی دہشت گردی نہیں ہوتی۔ کیونکہ مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا، پس جب کوئی مذہب انسان دوستی، اخلاقیات اور ایثار و رواداری جیسے اعلیٰ اوصاف کا پیامبر ہو تو ان میں دہشت گردی جیسے مذموم صفت والا فعل کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ دراصل یہاں مذہبی دہشت گردی سے مراد نام نہاد طور پر مذہب کا نام استعمال کر کے دہشت پھیلانا ہے۔ عقائد و افعال، ساسیات و فروعات میں اختلافِ رائے کی بنیاد پر مخالفت، تنقید بلکہ تنقیص اور تفرقہ بازی کو ہوا دینا اس قسم کی دہشت گردی میں شامل کئے جاسکتے ہیں۔ دراصل اس قسم کے دہشت گردی میں ایسے علماء اور دانشور تیار کیے جاتے ہیں جو لوگوں میں مذہبی اور مسلکی طور پر فرقہ وارانہ تعصب ابھارتے ہیں۔

علاوہ ازیں مختلف مصنفین و مرتبین اور مولفین نے کچھ دیگر قسمیں یا انواع کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ جن میں سٹیٹ سپانسر دہشت گردی، دائیں بازو، بائیں بازو کی دہشت گردی، نیشنلسٹ دہشت گردی، Anarchist دہشت گردی، suicide دہشت گردی، اور سائبر [Cyber] دہشت گردی قابلِ تذکرہ ہیں۔

دہشت گردی کے واقعات خواہ چھوٹے پیمانے پر ہوں یا بڑے پیمانے پر، طویل یا مختصر وقفوں کے ساتھ ہوں یا پھر مسلسل و متواتر مگر ان کے نتائج و عواقب اور اثرات یقیناً بہت دور رس ہوتے ہیں۔ دراصل یہ کسی ایک صورت و شکل میں نہیں بلکہ مختلف اشکال میں اپنی جان لیوا اثر پذیری دکھاتے پھرتے ہیں۔

معاشرتی، معاشی، سیاسی، جغرافیائی، تہذیبی، ذہنی، جسمانی، طبی، نفسیاتی الغرض انفرادی اور اجتماعی طور پر ہر رُخ کو متاثر کرنے کی قوت نافذہ رکھتی ہے۔ اس میں کیا شک ہے کہ یہ ایک گھناؤنا فعل ہے۔ اُردو انسائیکلوپیڈیا میں رقم ہے:

> یہ ایک انتہائی گھِناؤنا فعل ہے۔ موجودہ زمانے میں شاید ہی کوئی ملک ایسا ہو گا جو تخریب کاروں اور دہشت گردوں کی انسانیت سوز اور سفاکانہ حرکات سے محفوظ ہو۔ دہشت گردی جنگ سے بھی زیادہ خطرناک ہے کیونکہ [اس میں] تخریب کار کھل کر سامنے نہیں آتا بلکہ عقب سے وار کر کے بے گناہ

شہریوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔

اور تو اور دہشت گردی کے بدترین اثرات کے حوالے سے جمیل احمد خان اپنا موقف یوں پیش کرتے ہیں کہ:

> دہشت گردی کے خلاف جاری جنگ نے دنیا بھر کے مجموعی فوجی اخراجات میں اس قدر اضافہ کر دیا ہے کہ میلینیم ڈویلپمنٹ گولز(Millennium Development Goals)کے نام سے کیے جانے والے تمام عہد شاید اب طاق نسیاں کا حصہ بن چکے ہیں۔ جن میں غربت کا خاتمہ، عالمی صحت کے مسائل، وبائی امراض کے خلاف جنگ اور کرہ ارض کے ماحول میں بڑھتی ہوئی ابتری کا تدارک شامل تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ دہشت گردی کی موجودہ لہر جو گزشتہ دو عشروں سے مسلسل اپنی موجودگی ظاہر کرتی رہی، کے اثرات کوئی بالکل غیر متوقع بھی نہیں کہ نامور مغربی مفکر آرنلڈ ٹائن بی نے عالمگیر تباہی کے خطرے کو محسوس کرتے ہوئے بہت پہلے بیان کیا تھا کہ آج انسانی بقا کو خود انسان سے خطرہ لاحق ہے۔ سائنس و ٹیکنالوجی کو جس بے جا طور پر انسانی انانیت اور ضرر رسانی کے سفاکانہ مقاصد کے لئے استعمال کیا جارہا ہے وہ زلزلہ، آتش فشاں، طوفان، سیلاب، خشک سالی، وبا، شارکوں اور خونخوار شیروں سے زیادہ مہلک اور خطرناک ہے۔ یہی تو وہ عفریت ہے جو انسانی زندگی اور اس کے بنیادی حقوق کو یکسر روند ڈالتی ہے۔

عالمی تناظر میں وطنِ عزیز میں ہونے والی دہشت گردی کے مسائل کا تجزیہ آخر کار اسی نکتے پر ہی ختم ہو گا کہ اس بیماری کا علاج کیا ہو؟ اس مسئلے کا تدارک کیسے کریں۔ وہ کونسے قلیل المدت اور طویل المدت اقدامات ہیں جن پر عمل پیرا ہونے سے ہم من حیث القوم دہشت گردی سے پاک [Terrorism free] خطے کا خواب شرمندہِ تعبیر کر سکتے ہیں۔

ہر باشعور فرد نہ صرف اس بات سے کلی طور پر اتفاق رکھتا ہے بلکہ اس کا پرزور حامی و داعی بھی ہے کہ کہیں بھی کسی بھی صورت میں دہشت اور دہشت گردی کے زمرے میں آنے والے تمام تر اقدامات کبھی بھی نہیں ہونے چاہئے۔ خواہ بالواسطہ ہوں یا بلاواسطہ۔

تاہم، سوال یہ ہے کہ آخر عملی صورت میں اس کا سدِباب کیسے ہو؟ یقیناً اس 'کیسے' کا جواب ایک نہیں کئی ایک ہوں گے۔ بیک وقت مختلف زاویوں میں کام کرنا ہو گا۔ ان تمام جڑوں کو پنپنے سے پہلے ہی کاٹنا ہو گا جو آگے جا کر دہشت گردی کی ترویج میں مدد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ الطاف حسین قریشی لکھتے ہیں:

> دہشت گردی کے اسباب نہایت گہرے اور وسیع ہیں۔ لہٰذا ان کے جڑوں تک پہنچنے اور انہیں اکھاڑ پھینکنے کے لیے غیر معمولی تدبر اور استقامت سے کام لینا ہو گا۔ ہنگامی اور فوری نوعیت کے ضروری اقدامات کے ساتھ ساتھ حکومت کو سمجھدار اور تجربے کار شخصیات پر مشتمل انسدادِ دہشت گردی کمیشن قائم کرنا چاہیئے۔ جو گہرائی میں جا کر تمام سیاسی، مذہبی، اقتصادی، تہذیبی اور بیرونی اسباب کا جائزہ لے۔ اصلاح احوال کے لیے شہریوں سے تجاوویز طلب کرے اور حکومتی اداروں کی صلاحیت اور کارکردگی کی روشنی میں ایک جامع رپورٹ ترتیب دیں۔

دہشت گردی نے پوری دُنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ آج دُنیا کا کوئی ایسا ملک دکھائی نہیں دیتا جو اس عفریت سے محفوظ ہو۔ تیسری دُنیا کے ممالک کے ساتھ ساتھ ترقی یافتہ ممالک بھی اس آزار سے بچے ہوئے نہیں ہیں۔ روزانہ اخبارات میں دہشت گردی سے متعلقہ کوئی نہ کوئی خبر ضرور ہوتی ہے۔ بے گناہ، معصوم اور نہتے لوگ بِلا کسی عُذر و گُناہ کے اس کا شکار بن رہے ہیں۔ رنگ، نسل، مذہب، ملت، زبان، قبیلے اور جنس کی تخصیص سے ماورا سِن و عُمر کی پابندیوں سے آزاد سبھی اِس موذی اور مہلک مسئلے سے دو چار ہیں اور بم دھماکوں، گولیوں، بوری بند لاشوں اور غیر طبعی موت اور اس کشت و خون کی ہولناکیوں سے متاثر ہو چکے ہیں یا ہو رہے ہیں۔ وطنِ عزیز کا کوئی شہر، گاؤں، قصبہ، کوچہ حتیٰ کہ کوئی گھر اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام دُنیا اس مسئلے سے نپٹنے کے لئے نبرد آزما ہے تاہم تا حال اس مسئلے کا کوئی واضح اور جامع حل سامنے نہیں آ سکا۔ عسکری قوتیں جہاں طاقت کے زور پر اس تباہ کُن سیلاب کے خلاف بند باندھنے میں مصروف ہیں وہیں اہلِ قلم، دانشور، محققین، شُعرا اور ادیب بھی قلمی جہاد کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں کیوں کہ بِلا شرکت غیرے تمام اس بات پر متفق ہیں کہ؛

> دہشت گردی دورِ حاضر کا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے جس نے دُنیا کے بہت سے ممالک میں بسنے والے انسانوں کی زندگی کا

امن وسکون چھین لیا ہے، اِن میں سے کُچھ ممالک ایسے ہیں جہاں
اس مسئلے نے حکومتوں کے ایوانوں کو ہِلا کر رکھ دیا ہے۔

اگرچہ یہ بات سَو فیصد دُرست ہے کہ دہشت گردی اختیار کرنے والوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، اس کا تعلق کسی خاص عقیدے اور مسلک سے نہیں ہے تاہم اس تلخ حقیقت سے بھی کسی طور انکار ممکن نہیں کہ دہشت گردی اور اس نام پر ہونے والی تمام تر کارروائیوں کے اثرات قریب قریب ایک ہی دین کے پیروکاروں پر سب سے زیادہ پڑتے دکھائی دیے ہیں۔ آج کوئی بھی ایسا ذی شعور اس حقیقت کو ہر گز جھُٹلا نہیں سکتا کہ پوری دُنیا میں دینِ اسلام سے تعلق رکھنے والے افراد ہی اس عذاب کا زیادہ تر شکار بنے ہیں، اور مسلم اُمہ سے زیادہ دیگر طبقات اس مسئلہ کی ایذا رسانی سے ہر گز متاثر نہیں ہوئے۔ اس بات کی وجوہات جو کچھ بھی ہوں، چاہے اپنوں کی نادانی، غیروں کی عیاری یا دونوں مگر نتیجتاً بالواسطہ یا بِلاواسطہ، براہِ راست ہر دو طرح سے اس دنیا کے مسلمان ہی زیادہ تر مالی، جانی، عقلی، فکری، تہذیبی، سیاسی، انفرادی اور اجتماعی نقصان اُٹھا رہے ہیں خواہ اِسے سزا کہیے یا آزمائش مگر زمینی حقائق میں یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ بقول ڈاکٹر حق حقی:

ہم پانچ صدیوں کا ماتم چھے صدیوں سے منا رہے ہیں۔ نہ
ہمارا ماتم کٹتا ہے نہ ہی سختی' مسلم اُمّہ مسلسل بھنور کی آنکھ
میں اور مستقلاً خون آشامی کی زد میں ہے۔

اگر مذہبی بنیادوں سے ہٹ کر اگر وطنی حوالوں سے پرکھا جائے تو دہشت گردی سے پیدا ہونے والے مسائل کا سب سے زیادہ شکار وطنِ عزیز پاکستان میں بسنے والے افراد ہیں۔ دوسروں کی جنگ کو خود رضا مندی کے طور پر اور سیاسی مصلحتوں کی بِنا پر اپنے اوپر حاوی کر لینے سے مختلف ادوار میں وطنِ عزیز کو نہ صرف مہاجرین کی آبادکاری جیسے مسائل اور اس سے پیدا ہونے والی پیچیدہ اور غیر یقینی صورتحال کا سامنا کرنا پڑا ،وہیں معاشی عدم توازن، رہائش وطعام کی پیچیدگیوں، افراطِ زر، سماجی و معاشرتی جرائم، اخلاقیات، اور بنیادی سہولتوں کی فراہمی کا فقدان جیسے مسائل کا بھی جنم ہوا جس سے تا حال نکلنا اور راہِ نجات حاصل کرنا ممکن نہیں ہو سکا۔ سلمان عابد کے مطابق:

پاکستان کو ایک بڑی پیچیدہ اور مشکل جنگ کا سامنا ہے۔
اِس جنگ میں ہمیں اپنے دُشمن کا داخلی اور خارجی دونوں
محاذوں پر سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ یہ کیفیت کسی بھی ریاست

یا معاشرے کے لئے حالتِ جنگ سے باہر نہیں۔

اگرچہ مذہبی بنیادوں اور وطنی حوالوں سے اس مسئلے نے ہماری بنیادوں کو ہِلا کر رکھ دیا ہے، تاہم اس سے بھی زیادہ اہم اور غور طلب بات انسان اور انسانیت کا قتل ہے۔ دہشت گرد جب بھی اس خطے کے کسی بھی علاقے پر کوئی بھی مذموم مقصد کے تحت حملہ آور ہوئے ہیں تو انسانیت تڑپی ہے اور آدمیت خون میں نہلائی ہے۔ رنگ نسل، مذہب، فرقے اور زبان کی بنیادوں سے ماوراہو کر ظلم و بربریت پر ہر آنکھ اشکبار اور ہر دل ماتم گُسار ہے۔ کیونکہ وطن میں بسنے والے کسی ایک فرد کا قتل دراصل پورے پاکستان کا قتل ہے اور اس نقصان کو تو وہ گھرانہ جس پر یہ غم آیا بہر حال سمجھ ہی سکتا ہے لیکن اس وطن میں بسنے والا کوئی بھی محبِ وطن بھی اس سانحے کا درد اور واقعے کے دُکھ کے مضمرات سے پہلو تہی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ایک جان کا نقصان بہت بڑا نقصان ہے۔

ب: پاکستان میں دہشت گردی کے مسائل کا تجزیہ، عالمی تناظر میں

پاکستان میں دہشت گردی بیرونی قوتوں کے سبب داخل ہوئی جنھوں نے اپنی مفاد پرستی، تنگ نظری اور دُنیا میں اپنی قوت اور حکومت کا لوہا منوانے کے لیے ہر طرح کے گھناؤنے کھیل کا آغاز کیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اپنے ہاتھوں سے تیار کی گئی طاقت اور قوت، اربابِ اختیار کے اختیار سے بھی باہر ہونے لگی اور پھر اِس سے نمٹنے کیلئے شور شرابا شروع کر دیا گیا۔ یوں دہشت گردی اور دہشت گرد قوتوں کو پوری دنیا میں متعارف کرا دیا گیا اور ساتھ ہی ساتھ ایک واویلا مچا دیا گیا کہ دنیا دہشت گردوں کے ہاتھوں غیر محفوظ ہے اور ہمیں اِس کو ختم کرنے کیلئے مِل بیٹھنا چاہیئے۔ اس ساری صورتحال کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ مُلکِ عزیز پاکستان کو اِس دہشت گردی سے انتہائی نقصان پہنچا اور اگر یہ کہا جائے کہ دہشت گردی نے پاکستان کو دُنیا کے کسی بھی دوسرے مُلک کی نسبت زیادہ تباہ و برباد کیا ہے تو اس میں کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہو گی۔ امریکہ نے اپنے سیاسی مقاصد کی تکمیل کیلئے افغانستان کے نام نہاد "جہاد" کو نہ صرف شروع کرایا بلکہ ہر سطح پر اسے اپنے منفی پراپیگنڈہ کے لئے استعمال کیا رُوس کو شکست سے دوچار کرنا اور دُنیا کو "یونی پاور" (Uni Power) میں تبدیل کر کے من مانی کے فیصلہ کرنا اہم ترین مقاصد تھے اور ان مقاصد کے حصول کیلئے پاکستان آلہء کار کے طور پر استعمال ہوا پھر یہ حتمی تھا کہ اس کے نتائج پاکستانی معاشرے، پاکستانی دفاعی اداروں اور عام عوام پر منتقل ہونے تھے جس کا خمیازہ ابھی تک پاکستان کی نسلیں بھگت رہی ہیں۔ امریکہ کے اِس ایجنڈے کو عملی شکل پہنانے میں ہم نے کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی اور جب امریکہ کو کامیابی مِل گئی روس ٹکڑے ہو کر بکھر گیا تو امریکہ نے

ہمارے ساتھ وہ بے رُخی اختیار کرنا شروع کر دی جو بڑی قوتوں کا خاصا ہوا کرتی ہے ہمیں اس کا اتحادی ہونے کے صلے میں انعام کی صورت دہشت گرد اور دہشت گرد ی ملی، اسلحے کے انبار، کلاشنکوف اور بم دھماکے ملے جس نے اِس قوم کے نہ صرف آرام وسکون کو برباد کیا بلکہ اِسکی نظریاتی وجغرافیائی سرحدوں کو بھی کمزور کر دیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلنے لگا کہ معاشرتی عمل کو اسلام، جمہوریت اور انسانیت کے تقاضوں کے مطابق چلانے کے بجائے دہشت، دھونس، غنڈہ گردی اور طاقت کے ذریعے آگے بڑھایا جانے لگا۔

دہشت گردی نے جب پاکستانی ریاست اور پاکستانی معاشرے کو مکمل طور پر اپنے شکنجون میں جکڑ لیا تو پھر اسے ایک قومی مسئلہ سمجھ کر اِس کے حل کی کوششیں شروع ہوئیں۔ اگرچہ اب بھی کچھ سیاسی دانشور اِس جنگ کو ایک قومی جنگ سمجھنے کے معاملے میں تذبذب اور فکری اُلجھاؤ کا شکار نظر آتے ہیں۔

اِس وقت فوج، عوام، تمام ریاستی اور حکومتی اِدارے اور سیاسی قوتیں مُلک کو ہر طرح کی دہشت گردی سے پاک کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں اَور ان سب کا یہ عزمِ مصمم نظر آتا ہے کہ کسی صورت میں بھی ان دہشت گرد عناصر اَور اِن کی پُشت پناہی کرنے والی قوتوں سے کسی قسم کا کوئی بھی سمجھوتا نہیں کیا جا سکتا۔

دہشت گردی کے جہاں داخلی عوامل ہیں وہاں ساتھ ہی ساتھ بیرونی قوتیں بھی اپنے منفی مقاصد کے حصول کے لئے اپنی انٹیلی جنس ایجنسیوں کے ذریعے اِس گھناؤنے کھیل کی آگ کو ہوا دینے میں اپنا اپنا کردار ادا کر رہی ہیں۔ ہمیں اِس دہشت گردی کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کے لئے کچھ اہم اِقدامات کرنے ہوں گے۔ جیسے کہ عالمی طاقتوں کو تیار کرنا کہ وہ نہ صرف دہشت گردی کی جنگ میں ہماری ہر طرح سے مدد کریں بلکہ خود بھی تضاد کی سیاست سے نکل کر دُنیا کو امن و امان کا گہوارہ بنانے میں سرگرم عمل ہوں۔ دوسرے مرحلے میں ریاستی اَور حکومتی اِداروں کی ہر ممکن کوشش ہونی چاہئے کہ ایسے عناصر پر کڑی نظر رکھی جائے اَور اُن کو کسی قسم کی مالی امداد کو ناممکن بنایا جائے۔ تیسرا اَور سب سے اہم قدم یہ ہو سکتا ہے کہ دہشت گردی کے حوالے سے افواجِ پاکستان، حکومت اَور تمام سیاسی قوتوں میں بنیادی باتوں پر اِتفاق ہونا از حد ضروری ہے تا کہ ایک مربوط اَور منظم قومی پالیسی اِس طرح ترتیب دی جائے جس پر سب قومی قوتیں متفق ہوں اَور یہ ایک قومی بیانیہ کی حیثیت اختیار کر جائے۔

جب ہم دہشت گردی کی وجوہات پر غور کرتے ہیں تو مختلف نظریہ فِکر کے حامل لوگ اپنی اپنی دانش کے مطابق اس پر روشنی ڈالتے ہیں۔ سیموئیل پی ہنٹنگٹن نے اپنی کتاب "تہذیبوں کا تصادم" میں دہشت

گردی کی ایک بڑی وجہ تہذیبوں کی بنیاد پر تشکیل دیا گیا بین الاقوامی نظام ہے جو عالمی اَمن کے لئے سب سے زیادہ خطرہ ہے۔ اُن کا موقف ہے کہ اِنسان نے خود کو مذہب، رنگ، نسل، آباؤ اَجداد، رسم ورواج کی بنیاد پر شناخت کروایا ہے اَور رُوس کی تقسیم کے بعد امریکہ اَور رُوس کے مابین سَرد جنگ کے خاتمے سے اَب دنیا کے لوگوں میں تقسیم و تفریق کی ایک بڑی وجہ نظریاتی یا معاشی نہیں بلکہ ثقافتی بھی ہے۔ عالمی سیاست ثقافتی خطوط پر ہی نئے سِرے سے تشکیل پا رہی ہے اَور دُنیا کے نئے نئے نقشے متعارف ہو رہے ہیں۔ مسلم آبادی کا دھماکہ خیز اضافہ، مشرقی ایشیا کا معاشی اُبھار بھی عالمی سیاست پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ اِسی طرح نیوکلیائی ہتھیاروں کے پھیلاؤ، ترکِ وطن (امیگریشن)، انسانی حقوق اور جمہوریت نے بھی تہذیبی جھگڑے کو بھڑکایا ہے۔ چین کا اُبھرتا ہوا تاثر بھی مغرب کے لئے ایک چیلنج ہے۔ یہ تمام اُمور جہاں تہذیبوں کے تصادم کو جنم دیتے ہیں وہیں تہذیبوں کی بالادستی کے قیام میں ایک دوسرے کے خلاف برسرِپیکار ہونے کی خواہش میں دہشت گردی کے جنم لینے کا بھی ایک بڑا سبب ہیں۔ سیموئیل پی ہنٹنگٹن لکھتے ہیں:

> اُبھرتی ہوئی عالمی (گلوبل) سیاست میں بڑی تہذیبوں کی مرکزی ریاستیں سرد جنگ کی دو سُپر پاوروں کو دُوسرے مُلکوں کے لیے کشش اور گریز کے اہم قطبین کے طور پر جگہ لے رہی ہیں۔ یہ تبدیلیاں مغربی، آرتھوڈوکس اَور چینی تہذیبوں کے حوالے سے زیادہ واضح طور پر نمایاں ہیں۔ اِن تہذیبی بلاکوں میں شامل ریاستیں اپنے شناخت کے درجے اَور اِس بلاک سے اِرتباط کو ظاہر کرتے ہوئے اکثر مرکزی ریاست یا ریاستوں کے گرد ہم مرکز دائروں میں تقسیم ہونے کی طرف مائل ہوتی ہیں۔

اس سلسلے میں میڈیا کا کردار بھی اہم ہے۔ سلمان عابد اپنی کتاب "دہشت گردی ایک فکری مطالعہ" میں میڈیا کے کردار پر یوں لکھتے ہیں۔

> جہاں تک دہشت گردی انتہا پسندی کا تعلق ہے تو اس پر میڈیا کے کردار کو آج کے حالات میں ایک نئے زاویہ کے ساتھ غیر معمولی اِقدامات کی صورت میں دیکھنا ہو گا کیونکہ حالتِ جنگ میں ڈوبی ہوئی ریاست یا معاشرہ اِسی صورت میں اپنے لئے محفوظ راستہ تلاش کر

سکتی ہے۔ جب دیگر فریقین کے ساتھ بھی ریاستی بحران میں اپنی ذمہ
داری ایک ذمہ دارانہ طریقے سے ادا کرے۔

دہشت گردی کے سدِّباب کے لئے پوری قوم اَور تمام اِداروں کو مل کر ہر محاذ پر لڑنا ہو گا تا کہ آنے والی نسلوں کے لئے ایک خوشگوار ماحول اَور پُر اَمن پاکستان مل سکے۔ ڈاکٹر فرحان زاہد اس ضمن میں رقمطراز ہیں:

> دہشت گردی کے خلاف ایک مضبوط حکمتِ عملی وقت کی اہم ضرورت ہے، جو صوبوں اَور قانون نافذ کرنے والے اِداروں کو ایک واضح طریقہ کار اور پالیسی دے سکے۔ اِس کے علاوہ دُنیا کے دیگر ممالک کے تجربات پر بھی نظر رکھنی چاہیئے کہ اُنھوں نے اِس مقصد کے لئے کیسے سپیشل ٹاسک فورس بنائی جیسے کہ الجیریا، اسرائیل، ترکی، سری لنکا، اِٹلی، فرانس، جرمنی وغیرہ کے تجربات کو بھی سامنے رکھنا ہو گا۔

ج: اُردو ادب میں دہشت گردی کے اثرات بلحاظ موضوع

ادیب، شاعر، دانشور یا کوئی بھی تخلیق کار، اپنے کردار، اپنی سوچ، اپنے قلم کے زاویے، اپنی کہانی کا پلاٹ، اپنے معاشرے سے جمع کرتا ہے معاشرہ جس ماحول میں آگے بڑھ رہا ہوتا ہے ادیب وہی کُچھ سمیٹتا ہے جو کچھ اُس کے دائیں بائیں بکھرا ہوتا ہے اگر اُسے دہشت، وحشت، خوف، خون خرابہ، بم دھماکے اور لاشیں ملیں گی تو اُس کی کہانی، اُس کی نظم، اُسکا افسانہ اُس کا ناول، اُسکی پینٹنگ میں یہی کچھ منعکس ہو گا۔ ذیل کی سطور میں ہم دیکھیں گے کہ اُردو ادب کی مختلف بڑی اصناف یعنی ناول، افسانہ، غزل اور نظم پر دہشت گردی اور اس سے متاثرہ ماحول نے کِس انداز سے اپنا اثر چھوڑا ہے۔

ناول، افسانہ، غزل، نظم:

تخلیقی عمل کئی لحاظ سے ایک مُشکل اور تہہ دار عمل ہے جو احساس سے شروع ہو کر الفاظ تک پہنچنے میں بعض اوقات چند لمحے اور بعض اوقات کئی عشرے لے لیتا ہے۔ بعض تجربے تو ایسے ہوتے ہیں جو کسی تخلیق کار کی پوری زندگی میں بھی مکمل طور پر اظہار آشنا نہیں ہو پاتے۔ بات تو اُردو ناول کے حوالے سے ہے لیکن یہ خالص تخلیقی عمل سے جُڑا ہوا ایک گہرا پسِ منظر رکھتی ہے ایک تو اُردو ناول کی عُمر ہی بہت کم

ہے۔ عُمران معنوں میں کہ اُردو فِکشن کی تحریری صورت کو کم و بیش ڈیڑھ صدی گزر گئی لیکن ابھی تک خالص تخلیقی انداز میں لکھے گئے ناولوں کی تعداد شائد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔

دہشت گردی اور 💣/🗁🗁 کے حوالے سے دُنیا کے ممالک اور حساس ذہن جس کربناک تجربے سے گزرے اور گزر رہے ہیں جانے اِس سارے المیےؔ کو ہمارے تخلیقی شعور کا حِصّہ بننے میں کتنی صدیاں لگیں گی۔ ناول کے ضمن میں یہ بات انتہائی افسوسناک ہے کہ اُردو ناول '⌨🖳🖰🗁' کی جنگِ آزادی کے حوالے سے بھی ابھی تک اپنا پورا قرض ادا نہیں کر سکا یہی بات ⌨🗐💣🗁 میں تحریکِ آزادی پاکستان قیامِ پاکستان اور تبادلہ آبادی کے نتیجے میں گھر گھر جنم لینے والی کہانیوں کے ضمن میں ہے جو گزشتہ نسل کے ذہنوں میں کلبلاتی رہیں اور سپنوں ہی میں دفن ہو گئیں اور کاغذ پر کم کم ہی اُتریں یہ پس منظر اس لیئے ذہن میں آتا ہے کہ ہمارے ہاں اردو نثر اور شاعری کی کم و بیش پچاس ساٹھ اصناف میں سے اردو ناول وہ واحد صنف ہے جو تخلیقی عمل سے بہت کم آشنا ہوئی۔ یہ بات بالکل عیاں ہے کہ غزل، نظم، افسانہ، سفر نامہ کسی بھی صنف کے مقابلے میں ہمارے ہاں ناول بہت کم لکھے گئے اور جو لکھے گئے اُن کا بھی بڑا حِصّہ خواتین کے ڈائجسٹوں میں چھپنے والی کہانیوں کے پھیلاؤ پر مشتمل رہا۔ اِس مختصر تمہید کا مقصد اردو ناول کی تنگ دامنی کی طرف توجہ دلانا ہے۔

دہشت گردی کو موضوع بناتے ہوئے بہت کم ناول لکھے گئے ہیں اُردو زبان میں ایسے ناول کی تعداد گنی چُنی ہے ان میں سے کچھ قابلِ ذِکر ناولوں کا مختصر تعارف یہاں بیاں کیا جاتا ہے۔

"پو کے مان کی دُنیا" یہ ناول '🗎🗀🗀🗎' میں چھپا۔ اِس ناول کے تخلیق کار مشرف علی ذوقی ہیں۔ اِسی موضوع کی مناسبت سے بانو قدسیہ صاحبہ کا ناول "حاصل گھاٹ" قابلِ ذکر ہے اس ناول کا سنِ اشاعت '🗏🗀🗀🗎' ہے یہ ناول لاہور سے چھپا۔ مستنصر حسین تارڑ کا ناول "قلعہ جنگی" اِس فہرست میں سب سے قابلِ ذکر ہے یہ ناول '🗐🗀🗀🗎' میں لاہور سے چھپا۔ اس ناول کے مرکزی کردار سات زخمی طالبان ہیں جو ایک دوسرے سے قلعہ جنگی کے تہہ خانے میں ملتے ہیں یہ مختلف تہذیبوں، مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والے جنگجو ہوتے ہیں جو ناول میں ایک دوسرے سے اپنے واقعات بیان کرتے ہیں۔

اِسی طرح مستنصر حسین تارڑ کا ایک اور ناول "خس و خاشاک زمانے "جو '🗀🗁🗀🗎' میں سنگِ میل پبلی کیشنز نے لاہور سے چھاپا ایک پورا باب اس ماحول کی عکاسی کرتا ہے جس میں تہذیبوں کے تصادم اور افراتفری کے دور میں افراد ایک دوسرے سے ملتے ہوئے اس کشش و پنج کا شکار ہوتے ہیں کہ

دہشت گردی کے واقعات مختلف ممالک کو اپنی لپیٹ میں لے رہے ہیں ایسے میں سپر پاور کا کردار انتہائی اہم اور ذمہ دارانہ بن جاتا ہے۔ڈاکٹر فوزیہ چودھری نے اپنے مضمون "9/11 کے اُردو ناول پر اثرات" میں ناول میں دہشت گردی کے حوالے سے کیے گئے کام کو سراہا ہے اور اس موضوع پر ناولوں کی طباعت کو خوش آئند قرار دیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

> دوسری اصنافِ ادب کے برعکس اردو ناول کے حوالے سے یہ بات زیادہ قرینِ قیاس ہے کہ دہشت گردی اور دہشت گرد عناصر کو مکمل طور پر ایک ناول کا حِصّہ بننے میں ابھی کچھ وقت لگے گا یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہماری سیاسی اور سماجی زندگی میں کوئی بڑا واقعہ رونما ہو تو عصری ادب میں اس کا اثر ظاہر نہ ہو۔ دہشت گردی اور 9/11 کا واقعہ جس نے دنیا کے سیاسی، سماجی اخلاقی اور معاشی حالات کا رُخ بدل کر رکھ دیا ہو کس طرح ممکن تھا کہ عصری ادب اس کا عکاس نہ ہوتا۔22

گزشتہ دو عشروں میں پیش آنے والے اندوہ ناک لرزہ خیز واقعات اور سانحات سے جُڑی تحریروں کو پڑھ کر ایک خاص نوعیت کی ذہنی سراسیمگی کی حالت صاف نظر آتی ہے اور مسلسل پیش آنے والے دردناک حادثات، بم دھماکوں، ڈرون حملوں اور خودکش حملوں کے نتیجے میں اِنسانی جانوں کے ضیاع نے اس دور کے کہانی نویسوں، افسانہ نگاروں کو جذباتیت اور دُکھ درد سے سہمے ہوئے کئی ایک کرداراور بڑے مؤثر اور گہرے افسانے کے (پلاٹ) بھی مہیا کئے ہیں۔ نثری ادب میں افسانہ اپنی اہمیت رکھتا ہے۔ افسانہ کا دامن بڑا وسیع ہے اس نے اپنے دور کے ہر منظر کو کہانی کی شکل میں قاری کے سامنے پیش کر کے اُن حالات اور واقعات کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔ ایک افسانہ نگار کو ایک افسانہ تخلیق کرنے میں کئی ایک عوامل کو باہم جوڑ کر کہانی کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ مضبوط کہانی، مناسب کردار، کرداروں کا آپس میں مکالمہ، ماحول، اور پھر کہانی کا اپنے ماحول اور کرداروں کے ساتھ آگے بڑھنا اس لیئے بعض دفعہ ایک افسانہ نگار کو اپنا افسانہ تخلیق کرنے میں زیادہ وقت درکار ہوتا ہے۔ اِسی طرح ایک افسانہ نگار کو جذباتی واقعات اور جوشیلے کرداروں کو کہانی کے پیرائے میں ڈال کر رفتہ رفتہ آگے بڑھانا ہوتا ہے اس سارے عمل میں گہرے مشاہدے اور بھرپور داخلی کیفیت ہی افسانے کو شاہکار بنا سکتی ہے۔ مسعود مفتی کا افسانہ "شناخت" جو '2002' میں چھپا۔ یہ افسانہ دہشت گردی اور اس کے اثرات کے حوالے سے ایک بہترین افسانہ ہے۔ اِس افسانہ کا مرکزی کردار خالد کو

افسانے میں عجب کشمکش کا شکار دِکھایا گیا وہ نئی تہذیب امریکہ میں پلا بڑھا اور وہاں اُسے ایک لڑکی سے محبّت نے اپنی شناخت اور اپنا تہذیبی ورثہ بھولنے پر مجبور کر دیا اور وہ اُس سے شادی کر لیتا ہے لیکن 9/11 کے واقعہ نے اُس کو ہلا کر رکھ دیا جس کے بعد لوگوں سے امریکیوں کا رویہ یکسر بدل گیا۔ افسانہ نگار بڑی مہارت سے گیارہ ستمبر کے بعد کی صورتحال کو وہ دھچکہ قرار دیتا ہے جس سے بہت سے امریکی مسلمان اپنی شناخت کی طرف لوٹ آئے۔

اِس طرح کا ایک اور افسانہ "افتخار نسیم" کا ہے جو بعنوان "پردیسی" لکھا گیا اِس افسانے میں افسانہ نگار ایک سوال اُٹھاتا ہے "وہ کونسی دُنیا ہے جہاں کوئی رنگ، نسل، مذہب کی دیوار نہیں۔ کیا پوری تیسری دُنیا یتیم خانہ ہے"۔

نیلو فر اقبال کا افسانہ "اوپریشن مائس" بھی امریکی انتقام کی کہانی ہے۔ اِس افسانہ کا مرکزی کردار جنرل مرسی ہے جو خود پسندی اور پالتو جانوروں سے محبت میں گرفتار ہے لیکن تیسری دُنیا کے باشندوں سے اُسے نفرت ہے اور یہ اُن کی تضحیک کرتا ہے۔

اِسی طرح "عطیہ سید" کا افسانہ "بلقیان کا بُت" دہشت گردی کے تناظر اور ماحول میں لکھی گئی کہانی ہے جس میں ایک افغان بچّے کی بارودی کِھلونے سے کھیلنے کی روداد بیان کی گئی ہے۔

محمد حمید شاہد کی کہانیوں کا مجموعہ "مرگ زار" ہے یہ ساری کی ساری کہانی دہشت گردی، عالمی طاقتوں کا جنون، عام شہری، جذبات اور احساسات میں ڈوبی ہوئی ہیں۔

ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ اردو افسانہ اپنی سماجی اقدار سے مکمل طور پر جُڑا ہوا ہے اور جس شدتِ احساس سے ان واقعات کو اردو ادب میں موضوع بنایا گیا ہے وہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ پاکستانی افسانہ نگاروں نے دہشت گردی، 9/11 کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صُورتحال امریکیوں کی ندامت، مذمت، مزاحمت اور مقامی لوگوں کا دہشت گردی کے خلاف ڈٹ جانا اور ساتھ ہی ساتھ مجاہدین کے جذبے کو بھی قلم بند کیا۔ اِس نوع کے اعصاب شکن تجزیوں اور منفی تاثرات کے درمیان ہمارے ادیب اپنے اپنے قلم کا دیا جلائے ہوئے ہیں اور ہمارے اُردو ادب اور افسانے کی فضا میں ان انسانی المیوں کا ہر رنگ جھلکتا ہے۔

اُردو غزل اپنی جِدّت پسندی اور اپنے موضوعاتی تنوع کی بنیاد پر انتہائی مقبول صنف ہے۔ غزل کے مقبول شاعروں نے انتہائی کمال سے اپنے شعروں میں دہشت گردی کے واقعات اور وحشت اور خوف کی فضا

کو جگہ دی ہے یہاں یہ بات قابلِ ذِکر ہے کہ اُردو غزل کے مضامین دہشت، وحشت اور سُنسانی کا بیان منیر نیازی کے ہاں بہت زیادہ مِلتا ہے لیکن حالیہ دہشت کی فضا اور خوف کے ماحول اور منیر نیازی کی وحشت کا کوئی جوڑ نہیں وہ تنہائی اور جنگل بیابانوں کی وحشت تھی جبکہ موجودہ دور کے شُعرا کو جس وحشت اور دہشت کا سامنا ہے وہ بم دھماکے اور بارود کے نتیجے میں پھیلنے والی ہے جس کا نشانہ معصوم اِنسان ہیں جن کے چیتھڑے فضاؤں میں اُڑتے نظر آتے ہیں اور شاعر اپنے اس درد اور اپنے گردِ پھیلی فضا کو اپنے شعروں میں سمو لیتا ہے۔

اُردو غزل نے ہر دَور کے دَرد و الم کو اپنے شعروں میں جگہ دی ہے اِس کا دامن ہر طرح کے تجربات اور موضوعاتی پہلوؤں سے نکھرا ہوا نظر آتا ہے اِسی تناظر میں دہشت گردی اور اِس کے خوف کے زیرِ سایہ تخلیق ہونے والی غزل بھی اپنے دور کی بہترین عکاسی کرتی ہے۔ڈاکٹر ریاض مجید کے مطابق:

> غزل کی تہذیبی شائستگی کا بظاہر انسلاک خواص کے طبقہ سے نظر آتا ہے لیکن اگر اس صنف کی تہہ میں اُتر کر اس موضوعات و مضامین کا بنظرِ غائر مطالعہ کریں تو ہمیں اُس کی جُڑت عوام کے ساتھ زیادہ دکھائی دے گی۔اپنے مخصوص علائم و رموز، ہیئتی خصوصیات اور صنفی خوبیوں کے سبب ▭ ▭/◉ٹ کے واقعات کے سب سے زیادہ اثرات بھی اُردو غزل پر ہی مرتب ہوئے۔غزل کی صنف میں وہ لچک موجود ہے جو اِسے ہر طرح کے اظہار کے قابل بنائے رکھتی ہے۔ کوئی بھی دَور، کیسا بھی وقت ہو؟غزل پسند طبیعتوں کی جولانی اپنا راستہ نکال ہی لیتی ہے۔ اظہارِ محض سے ترسیلِ بلاغتِ نظام تک اس میں بیان کے سبھی قرینے ہمیشہ موجود رہے ہیں۔▤▤

یہاں یہ بات قابلِ ذِکر ہے کہ اُردو غزل میں دہشت گردی کے حوالے سے، خوف اور وحشت کے حوالے سے، مزاحمتی تخلیقات کے حوالے سے، عام شہریوں کے دُکھ دَرد اور تکالیف کے حوالے سے جو انوکھے اور نئے خیالات سامنے آئے ہیں اُن کا حوالہ اِس دہشت گردی کی فِضا اور اس کا نشانہ بننے والا تخلیقی ذہن ردِّ عمل کے طور پر سب کچھ شعروں کی صُورت لوٹا رہا ہے۔جوہؔر میر میں ▭ ▭ / ◉ٹ کے دہشت گردی کے واقع کو اپنی غزل میں یوں جگہ دی ہے:

عمارت اپنے پاؤں پر کھڑی ہے

تو مٹی سارے گاؤں پر گِری ہے
بُلندی یوں گِری ہے پستیوں پر
کہ جیسے دھوپ چھاؤں پر گِری ہے

انور سدید کی یہ غزل آج ہی کی آواز ہے جو بد قسمت پاکستانی قوم کی خاموش نگاہوں میں اُٹھنے والے سوالوں، بے گُناہوں کی دھماکوں اور شعلوں میں دیتی ہوئی آوازوں، محکمرانوں کی آنکھوں پر چھائے ہوئے پتھریلے دھندلکوں اور عالمی لٹیروں کے نقاب اوڑھے بد نما چہروں کو بڑی سادگی سے یوں بیان کر دیتی ہے۔

جہاں کے تیز تیور ہو چکے ہیں
مگر ہم ان کے خوگر ہو چکے ہیں
گلی کوچوں پہ خاموشی ہے طاری
یہاں کے لوگ پتھر ہو چکے ہیں
کہاں جائیں کھڑے یہ سوچتے ہیں
کہ ہم دوبارہ بے گھر ہو چکے ہیں

دہشت گردی کی فضا میں تخلیق پانے والی غزل انتہائی خوبصورتی اور شائستگی سے ذہن اور خیال پر چھائے دہشت، وحشت، بارود، بم، دھماکے کے تصور کو پیش کرتی ہے اس تناظر میں کلیم شہزاد کی غزل کے یہ اشعار بہترین عکاسی کرتے ہیں۔

ہَوا میں کس نے یہ زہر گھولا کہ جسم نیلا زمین کا ہے
شباہتوں کو جمال کیسے مِلے گا بڑھتی بے چہرگی سے
بصارتوں کا یہ نور کیسا مِلا ہے جذبوں کو شہر ڈر میں
کلیم سجھیلی مسافتوں سے، بدن میں پھیلی شکستگی سے

پچھلے دو عشروں میں اِس قوم نے دہشتگردی کی کئی ایک خوفناک شکلیں اور صُورتیں دیکھیں اور برداشت کیں ہیں پھر اس قوم پر دہشتگردی کا لیبل لگنے کے باعث ایک احساسِ کمتری کا شکار ہو کر خود ہی اپنی آنکھوں میں گِرنے لگے ایسے میں ایک پستی میں گرنے کے خوف نے "ڈر" کو ایک ایسی علامت بنا دیا جو اس عشرے کے شُعراء کے ہاں بہت زیادہ استعمال ہونے لگی ہے۔ پاکستان کا ہر قصبہ، ہر شہر، ہر گاؤں، ہر گلی محلہ دہشت گردی کے نشانے پر ہے۔ پورا ملک عدمِ امن کا شکار ہے جس کے باعث حُسن، امن اور سکوُن کو آئے

دن کے پُر تشدد واقعات نے تہس نہس کر دیا ہے۔ ہر روز ہونے والے دھماکوں، ڈرون حملوں، ان دیکھی ہزیمتوں نے بچّے بچّے کے اندر خوف کی وہ فصل بو دی ہے جس کو کاٹتے کاٹتے ہاتھ شل ہو جائیں گے لیکن یہ اپر بیل کی طرح بڑھتی رہے گی۔ پشاور کے ایک شاعر 'فاروق جان آزاد' بہت دُکھ سے یوں بیان کرتے ہیں۔

پار اُترنا بھی ہے دُشوار یہ ڈر لگتا ہے
ہاتھ سے چھُوٹے ناپتوار یہ ڈر لگتا ہے
خوف طاری ہو تو پھر کیسے اُٹھائے گا کوئی
کانپتے ہاتھوں سے تلوار یہ ڈر لگتا ہے
چھت کی شہتیر کو اندر سے لگی ہے دیمک
گِرنا جائیں دَر و دیوار یہ ڈر لگتا ہے
بات دُشمن سے تجارت کی بڑھاوے کی کریں
لے ناڈوبے کہیں بیوپار یہ ڈر لگتا ہے
بادشاھی کا تمہیں شوق مبارک لیکن
چِھن نہ جائے کہیں دربار یہ ڈر لگتا

یہ پوری غزل دہشت گردی سے متاثرہ معاشرہ کا نوحہ ہے شاعر نے ردیف "ڈر لگتا ہے" استعمال کر کے پوری غزل میں یہاں رہنے والے ہر فرد کے اندر اُٹھنے والے اندیشوں اور خوف کو زبان دے دی یہ آج کی غزل ہے۔ دہشت گردی، ڈر، خوف، بارود، دھواں، دھماکہ، خون خرابہ، بارودی جیکٹ کے تناظر میں اُبھرنے والی آج کی غزل جو ثابت کرتی ہے کہ دہشت گردی کا نشانہ بننے والی قوم کا شاعر وجودی نفی سے نِکل کر شعوری اثبات کی طرف بڑھنے کا اِرادہ رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ وقت محض محبوبہ کا سراپا بیان کرنے یا معاملاتِ عشق بیان کرنے کا نہیں بلکہ حقیقتوں کو بے نقاب کرنے کا ہے اس لیے وہ تمام ٹھوس حقائق کے حامل موضوعات جو نظم میں بیان ہوا کرتے ہیں غزل کے خاص ایمائی رنگ میں بڑی خوبصورتی سے بیان ہونے لگے ہیں۔ آج کا غزل گو شاعر محض تصورات میں ڈوبا نہیں رہتا بلکہ عالمی سطح پر اُبھرنے والے حالات و واقعات پر گہری نظر رکھتا ہے۔

شاعر حساس دِل، دماغ اور آنکھ کا مالک ہوتا ہے۔ وہ اپنے اِرد گرِد سے خیالات کو کشید کر کے شاعری کے ڈھانچے میں ڈالتا ہے۔ دہشت گردی ایسا ہمہ جہت موضوع ہے کہ اِس پر اُردو ادب کی ہر صنف نے بھر

پور لکھااور چونکہ وطنِ عزیز کم و بیش دو عشروں سے اِس لحاظ سے نشانہ بناہوا ہے اس لیئے ادیبوں اور شاعروں نے اِس موضوع کو خوب بر تا۔ دہشت گردی اور اس کے نتیجے میں رونُماہونے والے تمام حالات وواقعات و سانحات کو شاعروں نے اپنی نظموں میں جگہ دِی۔اِس ضمن میں ایوب خاور کی طویل نظم "پاکستان کی کہانی،اس کی اپنی زبانی" ایک نمائندہ نظم ہے جو سارے واقعات،ماحول،سازش،بے حِسی اور بے بسی کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔اِسی طرح تبسّم کاشمیری کی نظم "آدمی کا المیّہ" بھی اسی دَور کے اِنسان کا نوحہ ہے۔ ڈاکٹر فاطمہ حسن کی نظم "جنگل ان کی یاد میں" شاعرہ سوات کے ماحول کو یاد کرتی ہے اور بین کرتی ہے کہ کبھی یہاں امن کا بول بالا ہوتا تھااور آج وحشت،دہشت،خوف،بم،بارود اِس امن کی وادی میں کھیتوں کی طرح اُگ رہے ہیں۔ اِس موضوع کے ہر پہلو کو عیاں کرتے ہوئے شاہنواز زیدی کی نظم "اب کے دوسو ساٹھ مرے ہیں" اپنی مثال آپ ہے۔

اب کے دوسو ساٹھ مرے ہیں
دہشت گرد تھے یااِنسان تھے
دین دار تھے یاشیطان تھے
خفیہ ہاتھ تھایاظاہر تھا
ایساکب تھا۔
آستین پر کوئی نشان ہو
مارنے والے مرنے والے سب مظلوم برابر کے ہیں

اِسی طرح زہرہ نگاہ کی نظم "ہزاروہ ابوجہل" میں اُس عمومی خوف کاہر پہلو نمایاں ہے جو اِس دھرتی پر بسنے والے ہر فرد کا مقدر بن چُکا ہے یہ نظم ایک طرح سے اُس شکست خوردگی کی علامت ہے جو اِس معاشرے میں بسنے والے ہر فرد کے چہرے سے عیاں ہے۔

چونکہ "اُردو نظم پر دہشت گردی کے اثرات" اِس مقالے کا موضوع ہے چنانچہ نظم کے حوالے سے تفصیلاً بحث آئندہ ابواب میں آئے گی۔

حوالہ جات:

مولوی فیروز الدین، فیروز اللغات، اُردو جامع، فیروز سنز لمٹیڈ، لاہور، س ن، ص

http://play.google.com/store/apps/details?id=.technospart.urduarabicdictionaryoffline۔

ویب سٹرز، نیو ورلڈ کالج ڈکشنری، چوتھا ایڈیشن، ایمرلڈ گروپ پبلشنگ لمٹیڈ انڈیانا، یو ایس اے،

ص۔

Oxford Eng-Dic-on Historical principles v-11, Clarendon press,۔

www.dawnnews.com/international۔ دسمبر

Oxford Eng-Dic-on Historical principles v-11, Clarendon press,۔ ص

اُردو انسائیکلوپیڈیا، فیروز سنز لمٹیڈ، لاہور، ص

آکسفورڈ انسائیکلوپیڈیا آف دی ماڈرن اسلامک ورلڈ، جلد، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، لندن،

ص

اعجاز ملک، پاکستان میں شناخت کا بحران، دوست پبلی کیشنز، ملتان، ص

مصطفیٰ اکیول، مترجم مقبول الٰہی پروفیسر، اسلام شدت پسندی کے بغیر مشعل بکس لاہور،

ص

نوم چومسکی؛ مسلم دنیا کی بے اطمینانی' فرنٹ لائن دہلی' انڈیا' مشمولہ روزنامہ جنگ لاہور،

نومبر، ص

امجد طفیل، دہشت گردی کے واقعات کی جانب کمیونٹی کا رویہ اور افعال، مشمولہ، شدت پسندی چند اہم فکری زاویے مرتبہ زاہد حسن، شرکت پریس لاہور' ستمبر' ص

۔ آکسفورڈ کونسائزڈ کشنری آف پولیٹکس، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس لندن، یوکے،

، ص

۔ اُردو انسائیکلوپیڈیا' فیروز سنز' لاہور' ء ص

۔ انسائیکلوپیڈیا آف امریکانا، والیم ، ڈنبرے لائبریری پریس، یو ایس اے،

ص

۔ دی ورلڈ بک آف انسائیکلوپیڈیا' والیم ؛ شیکاگو' امریکا'

صفحہ

۔ ایضاً، ص

۔ http//ur.m.wikipedia.org/wiki/D8، ستمبر

pm

۔ اُردو انسائیکلوپیڈیا، فیروز سنز لمٹیڈ لاہور، ، ص

۔ ورلڈ انسائیکلوپیڈیا، پیراگون ہاؤس پبلیشرز، لندن، یوکے، ص

۔ جیفری ایم لیوٹ، دہشت گردی کے خلاف جمہوری ممالک، عرفان امتیازی، مترجم، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ، ص

۔ ایضاً، ص

۔ اُردو انسائیکلوپیڈیا، فیروز سنز، لاہور، ، ص ۔

۔ جمیل احمد خان، ماہنامہ روحانی ڈائجسٹ، کراچی، شمارہ ستمبر ، ص

۔ الطاف حسین قریشی، ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ، کراچی، شمارہ فروری ، ص

۔ تصدق حسین راجہ، اسلام اور دہشت گردی، فن پبلی کیشنز، اسلام آباد، ، ص

۔ حق حقی، ڈاکٹر، ہوئے تم دوست جس کے، شفیق پبلی کیشنز، لاہور، ، ص

۔ سلمان عابد، دہشت گردی ایک فطری مطالعہ، جمہوری پبلی کیشنز، لاہور، ، ص

۔ سیموئیل پی ہنٹنگٹن، تہذیبوں کا تصادم، محمد احسن بٹ، مترجم، مثال پبلشنگ، لاہور،

، ص

🗏📁۔ سلمان عابد، دہشت گردی ایک فطری مطالعہ، جمہوری پبلی کیشنز، لاہور، 📄📁📂⌛، ص🗄🗏

🗏📂۔ فرحان زاہد، ڈاکٹر، انسدادِ دہشت گردی فورس کا قیام، سہ ماہی تجزیات، شمارہ اکتوبر۔
دسمبر📄📁📂🗄،
ص⌛📄

🗏📄۔ فوزیہ چوہدری، ڈاکٹر، 🖲/📂📂 کے اُردو ناول پر اثرات، مشمولہ، پاکستانی زبان و ادب پر
🖲/📂📂 کے
اثرات، اِدارہ ادبیاتِ اُردو، جامعہ پشاور، ص📂📁🗄

🗏🗏۔ ریاض مجید، ڈاکٹر، 🖲/📂📂 کے اُردو غزل پر اثرات، مشمولہ، پاکستانی زبان و ادب پر
🖲/📂📂 کے اثرات،
اِدارہ ادبیاتِ اُردو، جامعہ پشاور، ص🖲

🗏🗐۔ ایضاً، ص📂🗐

🗏🗄۔ انور سدید، ماہنامہ شام و سحر، لاہور، شمارہ اگست 📄📁📁🖰، ص📂📁

🗏⌛۔ کلیم شہزاد، پاکستانی زبان و ادب پر 🖲/📂📂 کے اثرات، اِدارہ ادبیاتِ اُردو، جامع پشاور، ص
📄⌛

🗏🖮۔ فاروق احمد جان بابر آزاد، سہ ماہی عطا، کشمیری بازار، ڈیرہ اسماعیل خان، شمارہ جون
📄📁📂📁، ص🖲🗏

🗏🖰۔ تاج الدین تاجور، ڈاکٹر، اُردو نظم پر 🖲/📂📂 کے اثرات، مشمولہ پاکستانی زبان و ادب پر
🖲/📂📂 کے
اثرات، ادارہ ادبیاتِ اُردو، جامعہ پشاور، ص🗏🖮

باب دوم: اُردو نظم پر دہشت گردی کے اثرات بلحاظِ موضوعات

الف: اُردو نظم میں دہشت گردی کے موضوع کی پیش کش

شاعری ابتدائے زمانہ ہی سے جذبات و احساسات کے بیان کا لطیف ذریعہ رہی ہے۔ شاعر نہ صرف معاشرے کا نباض ہوتا ہے بلکہ اس کی حیثیت ایک مورخ کی سی ہوتی ہے۔ جو اپنے عہد کے منظر نامے کو انتہائی حساس نظر سے مشاہدہ کر کے منظوم تاریخ رقم کر رہا ہوتا ہے۔

شاعری نے وجود میں آجانے کے بعد ہی سے اپنے عہد کی تصویر کشی کو ذریعہ اظہار بنالیا تھا اور مختلف زمانوں میں مختلف تہذیبوں اور قوموں کے اخلاق و رزائل اور محاسن و عیوب کو اپنے اندر سمونا شروع کر دیا تھا چاہے اس کا تعلق شاعر کی انفرادی ذات سے ہو یا اجتماعی حالات سے۔

اُردو شاعری نے بھی ہر دور میں اپنے عہد کے حالات کو بھرپور طریقوں سے اور مختلف حوالوں سے پیش کیا ہے۔ ابتدائی ادوار میں عشق، حسن، قدرتی مناظر، انفرادی تجربات، احساسِ نفس، خارجی معاملات وغیرہ اُردو شاعری کے موضوع رہے۔ بعد ازاں لکھنو عہد کی رنگا رنگی، عیش و عشرت اور افراد کی پر تعیش زندگی کی سرگرمیوں کو اُس نے بھرپور طریقے سے بیان کیا۔ سرسید احمد خان کی مقصدیت سے پیدا ہونے والی بدلتی صورتِ حال کو اُس نے اپنے اندر سمویا اور اس طرح ہر دور میں عالمی ادب پر پڑنے والے اثرات بالخصوص ترقی پسند ادب کو معاشرتی عکاس کے طور پر اپنے اندر ڈھالا۔ تحریکِ پاکستان کا سیاسی ہنگامہ برپا ہوا تو شاعری نے حالات کی منظر کشی کا ادراک کیا اور مقاصد متعین کو اُجاگر کیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد نوزائیدہ مملکت کی مشکلات، فسادات اور سیاسی منظر نامے میں اپنا فرض ادا کیا۔ حتیٰ کہ جنگی اثرات کو بھی قبول کر کے شاعری اپنے احساسات کو اُجاگر کرتی رہی۔ اور آج وطنِ عزیز جس عفریت یعنی دہشت گردی کا شکار ہے، اس کے اثرات، علائم، رموز اور متعلقہ جذبات و احساسات کو بیان کرنے میں پیش پیش رہی ہے۔

حالیہ ادوار میں پاکستان میں اُٹھنے والی دہشت گردی کی لہر نے کم و بیش ہر شعبہ ہائے زندگی کو متاثر کیا ہے۔ ہر طرف بکھرے ہوئے گرد و غبار، خون، آہ و سسکیاں، لاشیں، بارود کی بُو، خوف و ڈر کی فضا اور عسکری اِداروں کی ان عناصر سے نپٹنے کی جہدِ مسلسل میں نظم کے شعرا عوامی شعور کی بیداری، حالات کی منظر کشی کرنے، ظلم کے خلاف نفرت، امن کی آشا کی ترویج، ہمدردی کے جذبات، مامتا کے دُکھ، عوام الناس کے حوصلے، بڑھتی ہوئی مایوسی، غم و غصہ کی لہر اور دہشت گردی کے خلاف ردِ عمل کو بیان کرنے میں پیش پیش نظر آتے ہیں اور اُن کی تخلیقات سے محسوس ہوتا ہے کہ ان نازک صورتِ حال کو بھرپور طریقے سے جانچ کر ان شعرا نے ادبی حوالوں سے اپنا حصہ ڈالا ہے۔

ان نمائندہ شعرا میں احمد ندیم قاسمی، احمد فراز، امجد اسلام امجد، انور شعور، انجم سلیمی، اوصاف شیخ، ارشد معراج، اختر عثمان، اعتبار ساجد، جنید آذر، جلیل عالی، خرم خرام صدیقی، روش ندیم، ، رفیق سندیلوی، زہرہ نگار، سلیم کوثر، سلیم فوز، سحر انصاری، سید مبارک شاہ، شوق انصاری، شہزاد نیّر، علی محمد فرشی، فاخرہ بتول، فرحت عباس، فخر شناس، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، مقصود وفا، محمودہ غازیہ، محبوب حامد، نصیر احمد ناصر اور کئی دوسرے شامل ہیں جن کی شاعری بالخصوص نظموں نے اس موضوع کا احاطہ کیا ہے اور مختلف جہتوں پر قلم فرسائی کی ہے۔

دہشت گردی جنگ سے بھی زیادہ خطرناک ہے کیونکہ تخریب کار کھل کر سامنے نہیں آتا بلکہ عقب سے وار کر کے بے گناہ شہریوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دہشت گردی اور اس سے متاثرہ ماحول میں شاعر کی سوچ آمد و آورد الفاظ کے چناؤ، رویے، نظم کے برتاؤ، حتیٰ کہ اس کے لہجے اور ترنم کو بھی نیا زاویہ اور نیا رُخ دیا ہے۔

ڈر خوف، دبدبا، لرزا، جو بیرونی جنگ کی صورت اور ردِ عمل کے طور پر کبھی اُردو نظموں کا موضوع ہوا کرتا تھا اب اس کے اثرات اندرونی جنگ کی صورت اور ردِ عمل کے طور پر شاعر کے تخیل کو جِلا بخش رہے ہیں۔ شاعر امن کی آشا کا انکاری ہو یا پرچاری، بارُود دھوئیں، لاشیں، خون، بکھرے اعضا، چیخ پکار، بہن اور بھائی اُسے اپنی نظم کے مرکزی خیال بھی مہیا کرتے ہیں اور اُس کے خیالات کی بنت کے لئے ماحول، فضا، الفاظ اور معنی بھی مہیا کرتے ہیں۔ گویا جب شاعر کے ظاہری حواس دُکھ، درد، چیخ پکار، خون، قتل اور لاشوں سے متاثر ہوئے تو اُس کے دل اور ذہن کی ترجمانی کرنے والا قلم بھی روشنائی کی شناسائی سے منہ موڑ کر خون، خون ہو جاتا ہے، ایسے میں بم، بارُود، جیکٹ، وردی، کلمہ ء شہادت، حور، جنت، آہیں، سسکیاں، سب یکجا ہو کر دو دھاری تلوار کی صورت تخلیق کار کو لہولہان کرتے ہیں۔ ایسے میں نئے موضوعات تلاشنے نہیں پڑتے بلکہ انہیں برتنے اور پرکھنے کا سلیقہ مل جاتا ہے۔ اور اُردو نظم اس موضوع کو خوب احاطہ کرتے ہوئے دکھائی دیتی ہے۔ شاعر اپنے دائیں بائیں پھیلے خطرات و خدشات کی زَد میں رہتے ہوئے اپنے قلم کو ممکنہ فیصلوں کا سپاس نامہ تھما دیتا ہے۔ پھر وہ اپنے تخیل کو کبھی سکول کے بچوں کی زبان بنا کر پیش کرتا ہے۔ تو کبھی ان طلبا کی بہادری کو نمائندہ بنا کر پیش کرتا ہے۔ کبھی وہ ملک و قوم و ملت کی اساسی، نظریاتی بنیادوں کو مزید مضبوط اور پائیدار دیکھنے کا خواہاں ہے۔ کبھی وہ اپنے مسلح افواج کے جوانوں، پولیس کے بہادروں اور مقامی افراد کی جرات اور حوصلے کی داد دیتے ہوئے شکست خوردہ ذہن کی مذموم کارروائیوں کی مذمت کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ کبھی شاعر آس

،اُمید کے دامن پر امن کی پھولتی ہوئی سرسوں کا خواہش مند ہے تو کبھی اُس کو اس کے خواب کی چلمن میں وہ حسین دور نہیں دکھائی دیتے جہاں بچے خوشی کی دھول اُڑاتے پھرتے ہیں اور کوئی انہیں بم دھماکوں سے اُڑاتا دکھائی نہیں دیتا۔

یہی وجہ ہے کہ شعرا نے اس موضوع کو مختلف پیراؤں میں برتا ہے جس سے مزید کئی جہتیں بر آمد ہوتی ہیں۔ شاعر کا کلام خواہ کسی بھی صنفِ شاعری میں ہو ان سب سے ایک ہی پیغام کشید کیا جا سکتا ہے کہ یہ بم، بارُود، بھری جیکٹ، نعرہ، کچھ بھی امن کی خواہش، سکون اور اس ناسُور کو جڑ سے اُکھاڑنے کی کوشش کو ہائی جیک نہیں کر سکتا اور نظم میں یہ خیال زیادہ مربوط، منظم، مفصل، واضح اور ہمہ گیر پہلو کے طور پر ملتا ہے۔ اسی لئے شاعر نے اپنی باریک بینی، معاملہ فہمی، حساسیت، ملکی محبت اور سماجی تاریخ کو اپنی نظم کے ذریعے ہر خاص و عام تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو نظم میں دہشت گردی کے موضوع کی پیش کش شاندار بھی ہے اور قابلِ تعریف بھی۔

ب: نظم کے موضوعات میں تنوع

ادب کی کوئی بھی صنف ہو چاہے اُس کا تعلق نثری تخلیقات سے ہو یا شعری سے وہ ہر دم بدلے حالات اور تقاضوں کے مطابق جدت پسندی اور تنوع کی جانب گامزن رہتی ہے۔ یہ متنوع مزاجی اور حرکت پذیری معاشرتی، سماجی، معاشی بدحالی اور نفسیاتی الجھنوں سے لے کر حالاتِ حاضرہ، علاقائی اور بین الاقوامی معاملات کی رفتار اور سمت سے متاثر ہوتی رہتی ہے۔ نظم شعری انداز میں اپنے تخیل اور تصور کو موضوعاتی پیرائے میں بیان کرنے کا نام ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے مطابق:

> آج جب ہم نظم کا نام لیتے ہیں تو اس سے مراد نظم کا
> وہ مخصوص پیکر ہوتا ہے جو انکشافِ ذات کے عمل کو
> جنبش میں لاتا اور احساس اور خیال کے چھپے ہوئے
> نوک دار پہلوؤں کو منظرِ عام پر لانے میں مدد ثابت
> ہوتا ہے 🗁

نظم کی یہ خوبی ہے کہ یہ شاعر اور قاری کو بیک وقت وسعت، ندرت اور نئے پن پر اُکساتی ہے۔ اس طرح نظم جہاں کشادگیء نظر لاتی ہے وہاں نظم میں موضوعاتی گہرائی بھی ملتی ہے۔ ہم بڑی آسانی سے یہ بات

کہہ سکتے ہیں کہ نظم ذاتی، کائناتی، آفاقی اور مابعد الطبعیاتی سب موضوعات کو حلقہء تحریر میں لا کر قاری کو بلند تجربات کی طرف مائل اور قائل کرتی ہے۔اس ضمن میں ڈاکٹر وزیر آغا تحریر کرتے ہیں۔

اسی لئے یہ نظم واحد صنفِ سخن ہے جو داخل اور خارج
کے سنگم پر اپنے توازن کو قائم رکھتی ہے اور اسی لئے اس
میں فرد کے داخلی تجربے اور سماج کے اجتماعی تجربے میں
مفاہمت کا احساس ہوتا ہے بے شک اس کا پلڑا اجتماعی
تجربے کی طرف واضح طور پر جھکا ہوتا ہے تاہم یہ
انفرادیت کی خوشبو سے بے گانہ نہیں ہے

مظاہرِ فطرت سے لے کر اپنے گردو پیش کے حالات و واقعات کو نا صرف عمیق نظر سے دیکھنا بلکہ اسے اپنی داخلی کیفیت سے جوڑ کر ایک ایسے تخلیقی تجربے سے گزرنا جس میں خیالات، موضوعاتی ترتیب پا کر خود بخود قلم کا رُوپ دھار لیں یہ شاعر کی تخلیقی نمو کا بلند ترین درجہ ہے۔اور اُردو شاعری اس نسبت سے خوش قسمت ہے کہ ہمیں بار بار نظمیں پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ شاعر کسی ایسے ہی مرحلے سے گزرتے ہوئے یہ تخلیقی کارنامہ انجام دے گیا ہے۔

اُردو نظم کو نئے موضوعات دینے اور ہئیت کے تجربات گزارنے میں تمام شعرا نے اپنا حصہ ڈالا لیکن یہاں ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کی اُردو نظم کے خزانے میں قیمتی تخلیقات فراہم کرنے کے سلسلے میں حالی، آزاد، اقبال، میر اجی، ن م راشد، مجید امجد، قیوم نذر، جیلانی کامران، ضیا جالندھری، منیر نیازی، اختر حسین جعفری کے نام سرِ فہرست ہیں۔

ن م راشد اُردو نظم کا بڑا نام ہے۔اُن کی نظم کا دائرہ کار بڑا وسیع اور زندگی کو نئے اور انوکھے معنی دینے کی تگ و دو میں پھیلتا اور سکڑتا ہے۔ن م راشد کے ہاں زندگی سے بیزاری، بغاوت اور زندگی کو اُدھیڑ کر نئے تجربات کی کسوٹی میں پرکھنا بہر حال ہر صورت میں موجود ہے۔اور ڈاکٹر ضیا الحسن لکھتے ہیں:

ن م راشد کو بیشتر نقادوں نے اقبال کے بعد جدید
اُردو شاعری کا بڑا شاعر قرار دیا ہے۔اُن کا پہلا
مجموعہ "ماورا" شائع ہوا تو اُن کے موضوعات اور
آزاد نظم کی نئی ہیت کے خلاف ایک طوفان اُٹھ

کھڑا ہوا۔

مجید امجد اُردو نظم کا ایک اہم شاعر ہے۔ اُنہوں نے بھی موضوعاتی اور ہیتی تجربات سے اُردو نظم کو متنوع مزاجی سے روشناس کرایا ہے۔ مجید امجد کی نظم پر بھی بعض دفعہ اقبال کی نظم کی طرح غزلِ مسلسل کا گمان ہوتا ہے۔ اُن کی نظمیں کنواں، ریوڑ، طلوعِ فرض، سفر حیات وہ نظمیں ہیں جن میں مجید امجد نے اُردو نظم کے نئے پیرائے اور گم گشتہ اُفق تلاش کرتے ہوئے آنے والے دور کی تخلیقی سمت متعین کر دی ہے۔

مجید امجد کی نظم اگرچہ بڑی ورسٹائل ہے لیکن اس کے باوجود اُس کی نظم میں لپٹا انسان کہیں نہ کہیں سے تانک جھانک کرتے ہوئے اپنے اُوپر ہوتے ہوئے جبر و استبداد کی کہانی سُناتا ملتا ہے۔ طارق ہاشمی کے مطابق:

> مجید امجد کی نظم میں انسان کے بارے میں جس تصور کو غالب حیثیت حاصل ہے وہ اُس کے مجبور محض ہونے کا خیال ہے۔ انسان ایک مجبور محض وجود ہے جس پر وقت کا جبر کئی ایک حوالوں سے ظہور پذیر ہوا ہے۔ اس جبر کا تسلسل بھی کئی ایک زمانوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ اس جبر کے پس منظر میں کون سی قوت ہے تو مجید امجد اس سلسلے میں تقدیر یا کسی ماورائی وجود کو موردِ الزام نہیں ٹھہراتے بلکہ بعض زمینی حقائق کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ اگرچہ صدیوں کی شکست و ریخت نے انسان کے فنائے کلی کا حصہ بن جانے پر وقت کی بے رحمی کا کرب بھی اُن کی نظموں میں کسی دستِ غیب پر طعنہ زنی کرتے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔

ترقی پسند تحریک نے اُردو شاعری کو ایک نئے رنگ سے متعارف کرایا۔ اسی طرح بطورِ خاص اُردو نظم نے ترقی پسند تحریک کے سایے میں نئے خیالات اور افکار کی ترویج کی۔ اس تحریک میں سب سے اہم شاعر فیض احمد فیض ہے۔ فیض احمد فیض نے نہ صرف غزل اور نظم کی طرف توجہ کی بلکہ دونوں میں امتیاز حاصل کیا۔ فیض اقبال کے پیامی شاعر بھی ہیں۔ فیض کی شاعری کے متعلق الیاس میراں پوری رقمطراز ہیں:

> فیض نے نغمگی، امیجری، تشبیہ و استعارہ جیسی
> فنی تدابیر کو ہنر مندی کے ساتھ استعمال کیا اور
> اپنی نظموں کو دلکشی اور رعنائی کا پیکر بنا دیا۔
> جس طرح اقبال نے الفاظ کے معنی بدل دیئے

بعینہ فیض نے بھی اپنے اچھوتے اسلوب سے

ایک نیا شعری جہاں آباد کیا۔

نظم کی اپنی وسعت پذیری کی سب سے بہترین مثال ہمیں میر اجی کی نظموں میں ملتی ہے۔ اُنہوں نے موضوعاتی پہلو کے لحاظ سے بھی نظم کے دامن کو بہت کشادہ کیا اور ساتھ ہی ساتھ ہیتی لحاظ سے بھی نظم کو کئی نئے رنگوں سے نوازا۔ میر اجی نے اپنی نظموں کے لئے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جو بیک وقت ذہین قاری اور عام قاری کی گرفت میں آسکتے ہیں۔

نظم کا طریقہ کار ہے کہ ایک مکمل شخصیت کی طرح اپنی قوت کے بل پر آگے کو بڑھتی ہے اور اشیائے مظاہر کو مسک کرتی ہے۔ اور اجتماعی لاشعور کی طرف بھی لوٹ آتی ہے۔ جدید اُردو نظم میں داخلیت کے علم بردار، شعرا کی تخلیقات گزشتہ کچھ عرصے کے واقعات سے جُڑی ہوئی ملتی ہیں۔ اس عرصے میں انسانی معاشرے میں کئی طرح کی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ مادیت پرستی روز بروز بڑھنے لگی، انسان سے انسان کا رشتہ کمزور ہوتا چلا گیا۔ جنگ و جدل، حرص و لالچ نے انسانی رویوں کو جکڑ لیا۔ ایسے میں معاشرے کے حساس طبقے یعنی شعرا اور ادیبوں نے بھی اپنی تخلیقی خوراک اِرد گرد کے ماحول سے اخذ کرتے ہوئے انہی نظم کے موضوعات کو اس رُخ پہ موڑ دیا۔ یوں ہمیں اُردو نظم رومانوی دور سے نکل کر ایک نئے دور میں داخل ہوتے ہوئے ملتی ہے۔ جس میں شاعر اپنی نظم کے موضوعات کو بین الاقوامی مناظر سے جوڑتے ہوئے ترتیب دیتا ہے۔ چاہے 9/11 کا واقعہ ہو یا افغانستان پر امریکہ کی بمباری یا آئے دن بم دھماکے شعرا نے اپنی نظم کو موضوعات کے چناؤ میں آزاد چھوڑا ہوا ہے۔ یوں اُردو نظم آگے بڑھتے ہوئے دہشت گردی کے موضوعات پر لکھی گئی نظموں تک پہنچ پاتی ہے اور جدید دور کا نوحہ لکھتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

الغرض اُردو نظم میں شعرا نے معاشی، معاشرتی، گروہی، اخلاقی، مذہبی اور سیاسی ہر طرح کے موضوع کو اپنی نظم میں جگہ دی ہے۔ اس لحاظ سے اُردو نظم کا دامن بہت رنگین اور وسیع ہے کہ یہ بدلتے ہوئے حالات و واقعات کے مطابق شاعر کے ذہن کو متاثر کر کے اِس سے مطلوبہ شعری نتائج حاصل کر لیتا ہے۔ لہٰذا دیگر اسنافِ سخن کے مقابلے میں اُردو نظم کا کینوس زیادہ رنگین، حقیقی، خوبصورت اَور متنوع ہے۔

ج۔ انفرادی و اجتماعی دُکھ

اُردو نظم میں دہشت گردی سے متعلقہ موضوعات کے حوالے سے انفرادی اور اجتماعی دُکھ کئی حوالوں سے ملتا ہے۔ ذیل میں ہم اِن موضوعات کو جو انفرادی اور اجتماعی دُکھ کے بیان میں اُردو نظم میں موجود ہیں جائزہ لیتے ہیں۔

ماں اور ممتا

"ماں" کی محبّت اپنی اولاد سے ایک ایسی حقیقت ہے کہ اللہ باری تعالیٰ بھی اپنی مخلوق سے محبّت کا جب موازنہ کرتا ہے تو اُسے اپنی محبّت کے مقابلے میں کوئی اور محبّت دکھائی دیتی ہے تو وہ "ماں" کی محبّت ہے۔ دہشت اور وحشت کے گھمبیر سایوں میں ماں کے دِل پہ کیا گزرتی ہے اور وہ درد و کرب کی کِن کِن کیفیات کو روح اور بدن پہ جھیلتی ہے اِن سب لمحات کو نظم کے شاعروں نے اپنے تخّیل کی زینت سے قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔

دھرتی کو بھی "ماں دھرتی "کا رُتبہ دیا جاتا ہے۔ دھرتی بھی ماں کی طرح امن اور سکُون کی مُتلاشی ہے۔ یہ اپنی کوکھ میں پھُول کِھلاتی ہے تاکہ ماں کے ارمانوں کی خوشیوں چہکیں نہ کہ اُس کے ارمانوں کا خون ہو جائے ماں اور ماں دھرتی کے جذبات کو نظم کے شعرا نے موضوعِ سخن بنایا ہے۔

"ممتا" وہ جذبہ ہے جس کے زیرِ سایہ "ماں" اپنے سپوتوں کو نرم کلیوں اور کونپلوں کو اپنی دُعا کی سوغات میں پروان چڑھاتی ہے۔ یہ جذبہ اِس قدر طاقتور اور توانا ہے کہ اِس کی شِدت کو نہ صِرف خواتین شعراء نے اپنے کلام کا حِصّہ بنایا بلکہ مرد شعراء نے بھی ممتا بھرے جذبات کو اپنی نظم میں دہشت اور وحشت کے تناظر میں انتہائی کمال سے برتا ہے۔ ممتا بھرے جذبات میں ڈوبی یہ نظمیں ہمیں یہ احساس دلاتی ہیں کہ موجودہ دور کا شاعر بالعموم اور نظم کا شاعر بالخصوص اپنی شعری زندگی میں حالات و واقعات اور گرِد و پیش سے خیالاتی آکسیجن لیتا ہے اُس کی ندرُت اور جِدت اُس کی نظموں سے موضوع کی مناسبت سے اخذ کی گئی ہیں۔ احمد ندیم قاسمی اپنی نظم "افغانستان" میں ماں کی گود کے اُجڑنے کو ارض اور عرش دونوں کے لئے قیامت سمجھتے ہیں:

بچے جب موت کے گھیراؤ میں چیخے
تو یہ سب نے دیکھا
ہفت افلاک تڑختے ہی چلے گئے
ماؤں کی کوکھ جب اُجڑی

اِن نظموں میں جہاں دہشت اور وحشت نااُمیدی اور مایوسی کی جھلک مِلتی ہے وہاں ایک اُمید افزا اور مثبت پیغام بھی موجود ہے کہ قوم کی مائیں ایسی پود تیار کر رہی ہیں جو خوف زدہ ماحول میں بھی اپنی کارکردگی اور جوہر دِکھانے کیلئے ہر وقت سرگرم نظر آتے ہیں۔

شاعروں نے پاکستانی معاشرے پر چھائی دہشت گردی کی فضا کو محسوس کر کے خارجی تجربات و حوادث کو داخلیت میں سمو کر ایک ایسے اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے کہ ایک طرف تو ماں کے جذبات کی ترجمانی ہوتی ہے جو وہ اپنی اولاد سے محبت کی صورت کرتی ہے اور دوسری طرف اُس کی خواہش کا پلّو اس دُعا سے بھی بندھا ہے کہ اُس کے پاک دھرتی سے یہ ناپاک ناسُور کب جڑ سے اُکھڑ کر اس کے باسیوں کو امن کی نوید سُنائے گا۔ اِن نظموں میں شاعروں نے ماؤں کی دُعاؤں کو، التجاؤں کو، بینوں کو قومی اور معاشرتی دُکھ میں بدل کر ایک ایسے نوحے کو ترتیب دیا ہے جو تاریخ کے اس سیاہ دَور کو دہشت گردی اور وحشت سے تعبیر کرے گا۔ جس نے اس مُلک کے باسیوں کا سُکھ، چین غارت کر دیا ہے۔ ایسے میں اُمید کی کرن شاعروں کی بلند خیالی ہے جو امن کے دِنوں کی نوید کو تکرار کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور جن کا دعویٰ ہے ظلم کی معیاد کے دِن تھوڑے ہیں۔

کشور ناہید ماں کے ممتا کے جذبے کو بچے کی زبانی اِس طرح پیش کرتی ہیں کہ لفظوں سے آنسو ٹپکتے دِکھائی دیتے ہیں۔ نظم "بصرہ کی مُردہ ماں کے لئے بچے کی لوری" میں ایک مُردہ ماں کے لئے اُس کے بچے کے جذبات پیش کرتی ہیں جو دہشت گردی کا شکار ہو چکی ہے:

اُٹھو ماں!
پوچھو ان بچوں کا حال جو
خندق میں چھپے تھے
پانی مانگتے مانگتے
جن کے ہونٹ ادھوری بات بنے تھے
ساری دُشمن دُنیا
میرے ننگے بدن کو تصویروں میں ڈھال رہی ہے
تم شرمندہ مت ہونا ماں

اُٹھو اماں

اُٹھو اماں

جواز جعفری کے ہاں بھی ماں، ماں کی ممتا، ماحول میں موجود قتل و غارت میں مرنے والے بچوں کی بے بسی اور موت کے وقت ماں کی عدم موجودگی کے موضوعات ملتے ہیں۔ وہ اپنی نظم "میں جنگ کی بارات کا دولہا ہوں" میں ایک ایسے ہی بچے کے مرنے کے واقعے کی منظر کشی کرتے ہیں جو بارود زدہ ماحول میں مرتے وقت اپنی ماں کی بانہوں میں دَم توڑنا چاہتا ہے لیکن ماں تو اُس سے پہلے ہی داعی اجل کو لبیک کہہ چکی ہے۔

موت میرے سینے میں گھونسلا بناتی ہے
اور خوف
میری ہڈیوں کا مسافر ہے
یہ میرے جوان اور گرم ہاتھ
جو کبھی میری محبوب عورتوں کی بوسہ گاہ تھے
موت اُن پر نشاں لگاتی ہے
کاش میرے مرنے سے قبل
اپنی بوڑھی ماں کو اپنی گود میں بھر سکتا
ہنسی کی موت پر آنسو بہانے والا کوئی نہیں

نصیر احمد ناصر اپنی نظم "اگر مجھے مرنا پڑا" میں ان ماؤں کے دُکھ اور مامتا کی بے بسی کو بیان کرتے ہیں جو فلسطین تا کشمیر، بوسنیا سے چیچنیا، عراق سے افغانستان تک بے گناہ اور بے وجہ دہشت گردی کا شکار ہوئیں۔ جو حاملہ تھیں لیکن ظالموں نے اُنہیں بھی نہ چھوڑا اور موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ ایسی بے گناہ ماؤں پر اُس لمحے کیا بیتی ہو گی جب اُنہوں نے خود کو اپنے نامولود بچوں سمیت مرتے ہوئے دیکھا ہو گا۔ ان کی موت نے ان کے وہ خواب بکھیر دیے ہونگے جو اُنہوں نے جنم دینے والے بچوں کے لئے سوچے تھے۔

اگر مجھے مرنا پڑا
تو میں اس کے لئے بخوشی تیار ہو جاؤں گا
لیکن یہ ضرور پوچھوں گا
کہ فلسطین سے کشمیر تک
بوسنیا سے چیچنیا تک

اور عراق سے افغانستان تک
لاکھوں بے گناہوں کو
اور اُن کے بچوں کو
جو ابھی ماؤں کے شکموں میں تھے
کس ضابطہء موت کے تحت مارا گیا
کیا اُن کی موت کو مشیتِ ایزدی سمجھا جائے؟

کشور ناہید اپنی نظم "خود کش حملہ کرنے والے بچے کے نام۔۔۔ماں کے آنسو" میں ماں کی مامتا کی بے بسی کو بیان کرتی ہیں۔ جو بد قسمتی سے ایک ایسے بچے کی ماں ہے جو خود کش بمبار ہے۔ ایسے موضوعات جہاں نفسیاتی الجھنوں کا شکار دکھائی دیتے ہیں وہاں ذہنی کشمکش کا ایسا تانا بنتے ہیں کہ قاری بے بسی کی انتہاؤں کو چھو لیتا ہے۔

جب تم گھر سے نکلے تھے
اُس وقت دُعا دینے والے
ماں کے ہاتھ کہاں گم ہو گئے تھے
سلامتی کے کٹورے میں پانی لئے
تمہاری بیوی یا بہن نے دو گھونٹ پینے کو نہیں کہا تھا
بولو اور بتاؤ تو سہی
تم نے الوداعی لمحہ کیسے گزارا تھا

اوصاف شیخ کے ہاں بھی ماں کی مامتا کا اظہار ملتا ہے۔ وہ موجودہ حالات کے تناظر میں ماں کی آنکھوں سے بچوں کے آنے والے دِنوں میں خوشی اور کامیابی کی بجائے دُکھ اور غم دیکھتے ہیں۔ وہ بچوں کو جو بوڑھے والدین کے بڑھاپے کا سہارا ہوتے ہیں اس خوف اور دہشت کی فضا میں مرتا ہوا دیکھتے ہیں اور ماں کے کرب میں اضافہ ہوتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔

نراس ماؤں کے برگزیدہ اُداس چہروں کو سوچ لینا
وہ جن کی آنکھوں میں اپنے بچوں کے آنے والے دِنوں کا غم
وہ جن کی بوڑھی رگوں سے بیٹے
لہو کا سارا خراج لے کر چلے گئے

اُردو نظم کی یہ خوبی کہ وہ کبھی بھی جمود کا شکار نہیں ہوئی اسے اوج تک لے جا رہی ہے۔ اُردو نظم کا شاعر ایسے مزاج میں کسی ایک نظریے کا پابند نظر نہیں آتا اگرچہ کہیں کہیں چند ایک مثالیں اس کے بر عکس بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر اُردو نظم کا دامن وسیع تر ہے اور موضوعات میں تنوع اِسے اُردو شاعری کی ایک مشہور ترین صنف میں شامل کرنے میں مدد دے رہی ہے۔ اُردو نظم کے شاعروں نے دورِ جدید کے تقاضوں کے مطابق کسی سیاسی اور مُلکی خارجہ پالیسی کی مجبوری کو نظر انداز کر کے اپنے شعری کمالات کو نظم میں اِس طرح ڈھالا ہے کہ اکثر وہ حاکمِ وقت کے خیالات اور افکار پر ضربِ کاری لگاتا ہے اور اپنی نظم سے فرہاد کے تیشے کا کام کرتے ہوئے ماں کی محبت کی لہر رواں دواں کر کے شدت پسندی، عسکری رجحانات، مذہبی انتہا پسندی کو یکسر رَد کر کے میر اپیام محبت ہے کی صدا لگاتا ہوا اس تشکیک زدہ دور سے بآسانی اپنے شعری وصف کے ذریعے اپنا نالہ بلند کر کے وقت کے فرعونوں کو چیلنج دیتا ہوا امن کی فضا کے لئے اپنے شعروں اور نظموں کی ہواؤں کو جلا بخشتا ہے۔

عام شہری

کسی بھی معاشرے کا حُسن اُس میں بسنے والے افراد ہوتے ہیں یہ افراد اکائی کی صورت بھی اہم ہوتے ہیں اور گھر، گروہ، معاشرے، محلے، گاؤں اور شہر کی شکل میں کسی مُلک کا اثاثہ ہوتے ہیں۔ کسی آفت، مصیبت یا مُلکی بحران کی صورت میں عام شہری اِن سے سب سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ پاکستان میں بسنے والے عام لوگ پچھلی دو تین دہائیوں سے کسی نہ کسی شکل میں جنگ، دہشت، وحشت، کلاشنکوف، بم، بارود، اور انتشار کا شکار ہیں۔ افغانستان میں روس کی جارحیت ہو یا امریکہ کی، پاکستان، افغانستان کا پڑوسی ہونے کے ناطے سے اِس جنگ کا براہِ راست نشانہ بنا اور پھر افغانستان سے مہاجرین کی آمد نے یہاں کے مقامی باسیوں کے لئے کئی طرح کے مسائل بھی پیدا کئے۔ اِن حالات میں پاکستان کے اندرونی حالات روز بروز خراب ہونے لگے، بم حملے، خود کش دھماکے، مذہبی انتہا پسندی نے اس مُلک کو اپنا مرکز بنا لیا۔ ایسے میں میں افراتفری، بد امن اور خوف و ہراس کی کیفیت یقینی تھی اور اِس کیفیت سے نکلنے کا جب کوئی راستہ سَجھائی نہیں دے رہا تھا تو ایسے میں حساس ذہن کا مالک شاعر عوامی اُمنگوں کی ترجمانی کرتے ہوئے اپنے موضوع سخن کو عوامی رنگ میں ڈال کر شعر تخلیق کرنے لگا۔ نظم کے شاعروں نے گلی، محلے، بس سٹاپ پر کھڑے عام لوگ، ریڑھی بان، دفاتر، سکول، کالجز اور یونیورسٹیوں میں کام کرنے والے مختلف مکتبہ ہائے فکر کے لوگوں کے دُکھ درد اور اُن کی روز مرہ تکالیف کو اپنی نظموں کا حصہ بنایا اور ساتھ ہی ساتھ اِس مُلک میں بسنے والے عام شہری کس طرح شِدت

پسندی، دہشت گردی، مذہبی انتہا پسندی کا نشانہ بنے۔ ان سب موضوعات کو اپنی نظم کا حصّہ بنا کر کبھی تو شعرا نے مسائل کا حل تلاش کیا اور کبھی تنقید کے نشتر چلاتے ہوئے اسے سیاسی اور عسکری اربابِ اختیار کو نشانہ بناتے ہوئے جنگ و جدل، قتل و غارت اور کرائے کی جنگ سے دُور رہنے کا مشورہ دے دیا۔ شوق انصاری کے مطابق:

یہاں بے کسوں کی حفاظت کہاں ہے
تحفظ کہاں ہے شرافت کہاں ہے
گراں نرخ چیزیں تسلسل میں فاقے
کہیں جان لیوا بموں کے دھماکے
کہیں پہ گماں ہے کہیں خود پسندی
کہیں پہ تعصب کہیں فرقہ بندی
مٹائی محبت کی تفہیم کس نے
کیا ابنِ آدم کو تقسیم کس نے

شاعر کی آنکھ تو چاند کو چاند بھی دیکھتی ہے اور روٹی بھی وہ رومانوی منظر نامے میں چاند کو سوئے فلک روشن دیکھتا ہے لیکن تلخ حقیقت کے تناظر میں اُسے بعض دفعہ وہ روٹی نظر آتا ہے۔ اس حوالے سے جہاں جدید نظم کا شاعر عام آدمی کا نوحہ لکھتا ہے وہاں وہ ایک دہشت گرد کو بھی عام انسان گردانتے ہوئے اُس کے خیال کی جنگ، اعصاب کی جنگ، اور اس پر سوار جنگ، کا نقشہ کھینچ کا قاری کو حیرت کی وادیوں میں گم تنہا چھوڑ دیتا ہے جہاں وہ شاعر کے لفظوں میں چھپے معانی تلاش کرتا ہے اور اس تلاش میں کبھی وہ اپنی ہمدردیاں عام آدمی کے حق میں ڈال دیتا ہے اور کبھی اُس خاص آدمی کے پلڑے میں ڈال دیتا ہے جو اب عام نہیں رہا بلکہ جان پر کھیلنے پر تُلا ہُوا ہے۔

شاعر عام آدمی کا دُکھ لئے ہوئے اپنے معاشرے کے اُس خاص آدمی سے مخاطب ہے جس کی نفسیات وہ سمجھ نہیں سکا لیکن اُس کا کردار آج اُس کی نظم کا موضوع بنا ہوا ہے۔ عائشہ بیگ عاشی اِسی خیال کو بیان کرتی ہیں:

انسان مر رہا ہے، انسان کٹ رہا ہے
اَن دیکھے وسوسوں میں چپ چاپ بٹ رہا ہے

نااہل حکمران کی تاویل کس لئے ہے
انسانیت کی اتنی تذلیل کس لئے ہے

پاکستانی معاشرے کے ہر فرد نے دہشت گردی کے اثرات کو محسوس کیا ہے وہ خوف وہراس کے اِس ماحول میں اپنے آپ کو، اپنے کردار کو اور اپنی سوچ کو مثبت رکھنے کی ہر ممکن کوشش میں مصروف رہا اور شاعروں نے اپنے اپنے انداز سے اُسی کے حوصلے بڑھانے کی کوشش کی تاکہ وہ اچھے دِلوں کی اُمید میں یہ تلخ دِنوں کی سختی کو برداشت کرے اور آنے والے دِنوں میں اِس ملک اور اِس میں بسنے والے افراد کے لئے چین ہی چین ہو۔

اِس سارے داخلی اور خارجی انتشار میں پِسا جانے والا طبقہ عام شہری ہے جس کو اُس کی سزا کی وجہ بھی معلوم نہیں اور نہ ہی وہ کسی جنگ وجدل، قتل وغارت میں ملوث ہونا چاہتا ہے لیکن بد قسمتی سے وہ اِس دہشت گردی کا سب سے پہلے نشانہ بنتا ہے۔ اُس کے لئے مسجد، مندر، کلیسا، چرچ، گھر، ہسپتال، سب جگہیں غیر محفوظ ہیں۔ اُس کے مدرسے، سکول، کالج، یونیورسٹیاں چوراہے اور گلیاں، بم دھماکوں، خودکش حملوں، اور خونریزی کی داستان پیش کرتے ہیں۔ ایسے میں اُس کو کئی طرح کی نفسیاتی اُلجھنوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے شاعر نے اپنے مزاج اور ادراک سے عام آدمی کی تمام کیفیات کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ اُسے داخلی تجزیے کی سان پر چڑھا کر ایک ایسے انداز میں پیش کرتا ہے جو موجودہ صورتحال پر ایک دلچسپ تبصرہ اور ایک تیز وتُند تنقید بھی ہے۔

شاعروں نے اپنے تخیل سے جہاں عام آدمی کی زندگی کو عام کیا ہے وہاں اُنھوں نے اُس کی موت کو بھی عام کر دیا ہے کہ کبھی شناخت نہیں ہو پارہی اور کبھی قبر بھی نصیب ہوتی ہے تو اجتماعی، جس پر نام کا کتبہ بھی سجنے نہیں پاتا۔ شاعر آدمی کے بخیے ہوتے ہوئے دیکھتا ہے اور شہر آشوب تحریر کرتا ہے جس کی گونج عام آدمی کی آواز بن کر ایوانِ اقتدار تک پہنچ جاتی ہے۔ فاخرہ بتول اپنی نظم "خون کی ہولی بند کرو تم" میں لکھتی ہیں:

دُنیا کے انصاف گرو! تم کب جاگو گے
امن کا پرچم اب لہراؤ
اب تو خدارا ظلم مٹاؤ
نیلی چھتری والے سے بھی
کچھ تو ڈرو تم

خون کی ہولی بند کرو تم

خالد احمد ایک عام آدمی اور عام شہری کے بہتے ہوئے خون پر محوِ حیرت ہیں۔ وہ اپنی دانست میں اُن وجوہات کو سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آخر کیوں ایک عام، نہتا اور بے گناہ شہری ہی سب سے زیادہ قتل وخوں کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ وہ کون لوگ ہیں جو اپنے مذموم مقاصد کی آڑ میں عام شہریوں پر گولیاں برساتے اور خود کش دھماکے کرواتے ہیں۔ کیا وہ زَر کے پُجاری ہیں یا بیرونی ممالک کے آلہ کار؟ خالد احمد کی نظم "یہ کس نے آبِ رواں چادروں میں باندھ لیا ہے" اِنہی سوالات کا استفساری اظہار ہے۔

یہ کس نے آبِ رواں چادروں میں باندھ لیا ہے
زمیں پہ کس نے زمیں کی حدود ٹھہرالیں
یہ کس نے مُجھ پہ میرا خون تک اُنڈیل دیا ہے

طلبا اور معصوم بچے

طلباء کسی مُلک کے روشن مستقبل کی اُمید ہوتے ہیں۔ یہی وہ سرمایا ہے جِن پر قومیں مان کرتی ہیں طلباء کی عِلمی اور فِکری نشوونما کے لئے درسگاہیں قائم کی جاتی ہیں اور ان درسگاہوں میں طلباء اپنی شخصیت کو جلا بخش کے نظریاتی اور فِکری اُفق پر جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ حالیہ دہشت گردی کی لہر نے نہ صِرف طلباء کو نشانہ بنایا بلکہ تعلیمی اِدارے بھی اِسکی زد میں آئے جہاں بعض مقامات پر تو بہت زیادہ جانی نقصان ہُوا جیسے کہ آرمی پبلک سکول پشاور میں 2014 کو پیش آنے والے حادثے میں ہُوا۔ اِسی طرح پشاور ہی کے علاقے میں اعتزاز احسن کی شہادت بھی ایک ایسا واقعہ تھا جس سے دُشمن اور خاص طور پر دہشتگردوں کے وہ مذموم عزائم سامنے آنے لگے کہ وہ کِس طرح اِس قوم کے طلباء کو نشانہ بنا کر اِس مُلک و قوم کے مستقبل کو تاریکیوں میں دھکیلنا چاہتے ہیں لیکن اِس قوم کے غیور عوام، طلباء اور اساتذہ کے حوصلے کی داد دینی چاہئے کہ اُنھوں نے کسی بھی خوف، دہشت اور وحشت کو خاطر میں لائے بغیر اپنے سیکھنے اور سکھانے کے عمل کو جاری وساری رکھا ہُوا ہے اور یہ عزم ایک نعرے کی شکل اختیار کر گیا کہ "مُجھے دُشمن کے بچّوں کو پڑھانا ہے"۔ یہ نعرہ اُس وقت مقبولِ عام ہوا جب آرمی پبلک سکول میں 132 معصوم بچّوں کو بے دردی سے شہید کر دیا گیا۔ دہشت گردی کسی بھی شکل میں ہو چاہے وہ مذہبی شِدت پسندی کا شاخسانہ ہو یا ریاست کو کمزور کرنے کے حربے ہوں ایک بات یقینی ہے کہ اس کو شکست دینے کیلئے ہر محاذ پر نبرد آزما ہونا پڑے گا معاشرہ کا ہر طبقہ اِسے اپنا فریضہ سمجھتے ہوئے اِس قسم کے جذبات کیخلاف اُٹھ کھڑا ہو تا کہ ہم اپنے مستقبل کو ہنستا بستا اور بڑھتا ہوا دیکھ سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ

شاعروں نے اپنی نظموں میں طلباء کی ہمت اور جذبے کو سراہتے ہوئے اُنھیں زَبردست الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ اور اِن معصوم طلبا کی قربانیوں کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ امجد اسلام امجد نظم "دلِ بے خبر ذرا حوصلہ" میں رقم طراز ہیں:

تیرے سامنے وہ کتاب ہے جو بکھر گئی ہو ورق ورق
ہمیں اپنے حصے کے وقت میں اسے جوڑنا ہے سبق سبق
ہیں عبارتیں ذرا مختلف مگر ایک اصلِ سوال ہے
جو سمجھ سکو تو یہ زِندگی کسی ہفت خواں کی مثال ہے
یہ جو شب نما سی ہے بے دلی یہ جو زرد رو سا ملال ہے
دلِ بے خبر ذرا حوصلہ

امجد اسلام امجد کے ہاں طلبا کا دُکھ اضطرابی کیفیت کا شکار ہے۔ وہ اس گھٹن کو محسوس کر سکتے ہیں جو دھماکوں کے نتیجے میں ملبے کے نیچے دَب جانے والے بچوں کو محسوس ہوتی ہے۔ اُن کے ہاں یہ قیامت خیز لمحہ ایسا لمحہ ہے جسے نہ اس سے قبل دیکھا گیا نہ ہی محسوس کیا گیا۔ نظم "مہلت" میں وہ اِنہی کیفیات کا عکس بیان کرتے ہیں۔

ملبے میں دبے چیختے بچوں کی صدائیں
یوں کان میں آئیں
جیسے کوئی برچھی ہو ہر ایک حرفِ نوا میں
آنکھوں میں ہے اُمید نہ تاثیر دُعا میں

جواز جعفری اپنی زِندگی پر اس لئے نادم دِکھائی دیتے ہیں کہ وہ اپنے بچوں کے لئے ایک دہشت زدہ ماحول چھوڑے جا رہے ہیں۔ اُن کے پاس ایسے لائحہ عمل کی کمی دکھائی دیتی ہے جو ایسے اقدامات اُٹھا سکے جو معصوم طلبا کے مستقبل کو محفوظ بنا سکے۔ وہ اپنی نظم "ایک حقیر ذرے پر غلبہ پانے کی ہوس" میں اپنی بیچارگی کا اظہار اِن الفاظ میں کرتے ہیں:

میرے بزرگوں نے
ایک بہتر دُنیا میرے سپرد کی تھی
مگر میں ایک بدصورت
اور غیر محفوظ دُنیا

اپنے بچوں کے حوالے کرنے پر مجبور ہوں!

بچّے تو جنّت کے پُھول ہوتے ہیں۔ پُھولوں کو بھلا کوئی مَسلتا، جھُلستا اور آگ میں جھونکتا ہے۔ کِس قدر سفاکی، بے دردی اور وحشیانہ عمل ہے جب بچّوں کو بھی اپنے مذموم مقاصد کیلئے بے دریغ قتل کر دیا جائے۔ بچّے تو معصوم ہوتے ہیں اُنھیں اپنی نفرت کا نشانہ بنا کر اللہ جانے سفاک اپنی سفاکی اور دہشت گرد اپنی دہشتگردی کا کونسا مظاہرہ کرنے چاہتے ہیں۔ آنکھوں میں اچھّے دِنوں کے خواب سجائے یہ ننھے منھے بچے اپنے بڑوں کے ہمراہ کہیں بھی تو محفوظ نہیں۔ وہ نہ اپنے گھر، نہ اپنی مساجد، نہ سکول، نہ گراؤنڈز، نہ پارکوں، نہ تفریح گاہوں میں آزادی سے گھُوم سکتے ہیں ہر وقت ایک انجانے خوف ایک بے رحم آنکھ کی منظر سے بچنے کیلئے کوشاں یہ بچّے اگر خود بچ بھی جائیں تو اِن کے پیاروں میں سے کوئی دہشت گردوں کا نشانہ بن جاتا ہے جس سے اُن پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔

تنویر دانش کی نظم "بابا آؤ کھِلونا لاؤ" بھی ایک ایسے بچے کی داستان ہے جس کا باپ دہشت گردی کا شکار ہو چکا ہے اور بچہ اپنے باپ کی کمی محسوس کرتا ہے۔ اُسے کھیلنے کے لئے کھلونا درکار ہے لیکن کوئی بھی اُسے کھلونا لا کر نہیں دے سکتا۔ بچہ خود بھی اس بات کا ادراک رکھتا ہے کہ اُس کی ضرورت پوری کرنے والا اُس کا باپ اس دُنیا میں نہیں ہے وہ تو دہشت گردوں کی دہشت گردی کا نشانہ بن چکا ہے لیکن اُس کا غم اپنے باپ کو بے اختیار ڈھونڈنے پر مجبور کرتا ہے اور وہ اپنی ننھی خواہشات کی تکمیل کے لئے باپ سے ملاقات کی حسرت میں گرفتار ہے۔

اچانک کسی صبح آجاؤ بابا
اُٹھو میری رانی کی آواز دے دو
ترستی ہوں بابا وجہ تو بتا دو
کہاں کھو گئے ہو جگہ تو بتا دو
گلے سے لگاؤ نہ آنسو رُلاؤ
میرے بابا آؤ کہانی سناؤ

ننھے بچوں کی موت کا دُکھ نصیر احمد ناصر کی نظم "اگر مجھے مرنا پڑا" سے بھی جھلکتا ہے۔ وہ ننھے بچوں پر ہونے والے مظالم کو اپنی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتے۔ کیونکہ یہ دُکھ ایک ایسا دُکھ ہے جسے کوئی ذی شعور تصور میں لا ہی نہیں سکتا۔ وہ اس دُکھ کو دیکھنے سے قبل خود ہی مر جانا پسند کرتے ہیں۔ نظم میں انہوں نے اس خیال کا

اظہار کیا ہے کہ اگر اُن کی موت کا وقت قریب آیا تو وہ موت سے مہلت مانگ کر اُن بچوں سے گفتگو کریں گے جو دُکھوں کی دلدل میں دھنس چکے ہیں۔ بچوں سے گفتگو کے دوران موت اس طرح الجھا کر رکھ دیں گے کہ موت اُن شہروں کا طواف کرنا بھول جائے جو خاص طور پر دہشت گردی کا شکار ہیں۔

اگر مجھے مرنا پڑا
تو میں بچوں سے باتیں کرتے ہوئے مرنا پسند کروں گا
اور اگر موت کو کہیں اور جانے کی جلدی نہ ہوئی
تو اُسے ڈھیر ساری نظمیں سناؤں گا
شاید اُس کا دِل پسیج جائے
اور وہ اُس روز
میرے علاوہ
باقی مرنے والوں کی جان لینا ملتوی کر دے
اور کراچی اور کوئٹہ جانا بھول جائے

نصیر احمد ناصر اپنی ایک اور نظم "خود کش" میں اُس خود کش بمبار کی نفسیات کا احاطہ کرتے ہیں جس نے اِس خوبصورت دُنیا کو اپنے حملے سے تباہ کرنے کی ٹھان لی ہے۔ اور اِس دُنیا کی خوبصورتیوں، رشتوں، تعلقات، حتیٰ کہ بچوں کی معصومیت کو خاطر میں نہیں لایا۔ خود کش بمبار رنگوں، پھولوں، تماشوں سے معمور دُنیا کو تباہ کرنے کا اِرادہ کر چکا ہے اس مقصد کے لئے وہ خود کو ہی تباہ کرنے پر تُلا ہوا ہے۔

تُجھے کن جہانوں میں جانے کی جلدی تھی
جن کے لئے تو نے
خود کو مٹانے کی ٹھانی
تماشوں سے معمور
پھولوں سے، رنگوں سے لبریز
جیون سے بھرپور
بچوں سی معصوم دُنیا کو
بم سے اُڑانے کی ٹھانی

آرمی پبلک سکول پشاور کے سانحہ 🗐🗁🗀🗎 کے حوالے سے بھی ننھے طلبا اور معصوم بچوں کے کرب و اذیت، اُن کے خوف اور دہشت گردی سے متاثرہ رویوں کو شعرا نے اپنی نظموں کا حصہ بنایا ہے۔ یہ وہ سانحہ تھا جس پر نہ صرف وطنِ پاکستان کے ہر خاص و عام کی آنکھ اَشک بار ہوئی بلکہ اِس کی مذمت میں بین الاقوامی ادب بھی خاموش نہ رہا اور اس نے ہمدردی اور اظہارِ یکجہتی کا اظہار بھی کیا۔ اس سانحہ سے متعلقہ موضوعات جہاں کرب، درد، شدت، آہ و بکا، چیخ پکار، بچوں کی معصومیت، ظلم، بربریت اور تشدد کا اظہار ملتا ہے وہیں شعرا نے متاثرہ بچوں کی زبانی اُن کی معصوم خواہشات اور تمناؤں کا بھی اظہار کیا ہے۔ اس کے علاوہ دسمبر کے استعارے جو اُردو شاعری بالخصوص نظم کا ایک رومانی اظہار بن چکے ہیں، کو بھی لہو سے رنگین استعارے کے طور پر سامنے لایا ہے۔

نوید ملک اِسی حوالے سے اپنی نظم "پشاور کے معصوم شہدا کے نام" میں لکھتے ہیں۔

عجب آیا ہماری زِندگی میں اک دسمبر
کہ اُس کے سرد لمحوں نے
نگاہوں میں لہو سے تَر، کچھ ایسے عکس
گاڑے
جواب تک منجمد ہیں
پگھلتے ہی نہیں 🗎🗎

د۔ اِدارے

دہشت گردی سے متاثرہ اُردو نظم نے مختلف اِداروں کے کرب اور اس کے ساتھ ساتھ اِن اِداروں پر پڑنے والے اثرات کو بھی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ اِن اِداروں میں عام طور پر ملک کے دفاعی اِدارے، تعلیمی اِدارے اور معاشرتی اِدارے جن میں گھر، دفتر وغیرہ شامل ہیں، خاص طور پر اُردو شاعری میں بطور موضوع دَر آئے ہیں۔

پاکستان کے دفاعی ادارے ہر لمحہ اپنی پیشہ ورانہ صلاحیتیں منوانے کیلئے کوشاں رہتے ہیں اور اِن کی صلاحیتوں کا اعتراف بیرونی مبصر اور تجزیہ نگار بھی کرتے ہیں۔ پاکستان جِس دہشت گردی اور انتہا پسندی کا شکار ہے اِس یلغار کو روکنے کے لئے دفاعی اداروں نے بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ دفاعی ادارے جہاں جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت میں کوشاں رہتے ہیں وہاں وہ نظریاتی محاذوں پر بھی سرگرمِ عمل نظر آتے ہیں۔ دہشت

گردی ہو یا مذہبی انتہا پسندی ہو دفاعی اِداروں نے ہمیشہ اس کی مذمت کی اور ایسے عناصر جو دہشت گردی، عصبیت، شِدت پسندی کی صُورت، اِس مُلک میں نفرتیں پھیلانا چاہتے ہیں ان سب کی سرکوبی کے لئے دفاعی اِداروں نے اپنا کردار بھرپور انداز سے ادا کیا۔

دفاعی اِداروں میں پاکستان آرمی، رینجرز، پاکستان پولیس، نیوی، ایئر فورس سب اِداروں نے اپنا کردار بخوبی ادا کیا۔ ضربِ عضب ہو یا ردالفساد دفاعی اداروں نے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے تن، من، دھن کی بازی لگائی ہے۔ اُن کے اِن جذبوں کو سراہتے ہوئے اُردو نظم کے نمائندوں شاعروں نے اُن کی کاوشوں کا اعتراف کیا۔ مُملکتِ پاکستان کے خلاف بالعموم اور دفاعی اداروں کے خلاف بالخصوص شِدت پسندوں اور مذہبی اور اسلامی تنظیموں کی کارروائیوں میں اُس وقت تیزی آئی جب پاکستانی حکومت نے 2001 میں افغانستان میں طالبان کی حکومت کی حمایت چھوڑدی۔ پاکستان کی عسکری قوتیں تقریباً دس سال سے ایک مسلح جنگ میں مصروف ہیں جو کبھی وزیرستان میں لڑی جارہی ہوتی ہے تو کبھی سوات اور گردونواح میں۔ عسکری اور سِول قیادت اب ایک بات پر متفق ہیں کہ دہشت گردوں سے اب ڈائیلاگ نہیں بلکہ اُن سے سختی سے نمٹا جائے گا سِول حکومت نے بھی 20 نکاتی قومی ایکشن پلان بھی تیار کر رکھا ہے۔ جس کے ذریعے دہشت گردی اور دہشت گردوں سے نمٹنے کیلئے ٹھوس اقدامات کی سفارشات کی گئی ہیں۔

ایسے حالات میں جب کہ مُلک کی تمام قوتوں کو متحد ہو کر دہشت گردی، شِدت پسندی، اور انتہا پسندی کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کی کوششوں میں مصروف ہیں ایسے میں اہلِ دانش، شاعر حضرات اور ادیبوں کا کردار بڑا اہم ہے کہ وہ قوم میں ایک سیاسی، سماجی، دینی، علمی اور فِکری شعور کو اُجاگر کرے تاکہ ہماری آنے والی نسلیں ایک پُر امن اور خوشحال پاکستان دیکھ سکیں۔ معاشرے کے فِکری انحطاط کی بحث نہیں لیکن ایک ایسے دور میں جب ریاستی حکومت دور فوجی قیادت ایک ایسی جنگ میں مصروف ہے جو ہم سب کی بقا کی جنگ ہے تو ایسے میں فِکری محاذوں پر ہمارے شعراء اور دانشور اپنے خیالات سے اور نظریات سے اِس قوم کی مثبت سوچ کی آبیاری کر رہے ہیں۔ ایسے میں ہمیں "نظم" میں بھی بھرپور تنوع اور گہرائی مِلتی ہے جس سے یہ احساس اُجاگر ہوتا ہے کہ ہمارے شاعر، ادیب، اساتذہ، دانشور، صحافی اور وکلاء سب انفرادی اور اجتماعی کاوشوں میں لگے ہوئے ہیں کہ جہاں قلم کی ضرورت ہے وہاں اُس کا استعمال کیا جائے اور جہاں تقریر اور اشاعت ونشاعت کی ضرورت ہے وہاں اُن سے کام لے کر مُلکی سلامتی اور دفاعی اداروں کی کامیابی کیلئے اپنا اپنا حِصّہ ڈالتے رہنا چاہئے۔

حکیم شہزاد اپنی نظم "ضربِ عضب کے جواں" میں عسکری جوانوں کے اوصاف گنواتے ہیں اور اُن کی بہادری اور ہمت کی داد پیش کرتے ہیں۔

دیکھو میرے وطن کے جوانوں کو اک نظر
سینہ ہے یا فولاد یا پھر شیر کے جگر
بالکل نہ ٹھہر پائے کبھی ان کے سامنے
لڑتے ہیں کیسے جم کے ماؤں کے یہ پسر

کیپٹن ارحم طارق بھی نوجوانوں کو وطن کی شان قرار دیتے ہیں اور اپنی نظم "تم روشن چہروں والے ہو" میں افواج کی بہادری کی تعریف کرتے ہیں۔

اِس دیس کی پہچان ہو تم
وردی میں ملک کی شان ہو تم
گھر چھوڑے اپنے کس کے لیے
سب ناطے توڑے کس کے لیے
کیا جذبہ ہے کہ لڑنے چلے
ہاں وطن کی خاطر مرنے چلے

ائیر کموڈور آصف شہزاد اپنی نظم "عمر کا سفر" میں دفاعی اِداروں کی شجاعت اور دلیری کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں اور وطنِ عزیز کے لئے اِن اِداروں کی پیش کی گئی قربانیوں کو امن کے اِقدامات قرار دیتے ہیں۔

تمہارے قدموں نے ریزہ کیا چٹانوں کو
پہاڑو سنگ تمہارے عزم سے لرزاں ہیں
لہو سے برگِ وطن اس طرح سے سینچا ہے
کہ اس کی کونپلیں بھی زِندہ و جاوید اں ہیں

میجر زاہد اسلام نظم "وطن کے نام" میں وطن اور اپنے عسکری اِداروں کے لئے اظہارِ یکجہتی کرتے ہیں اور اُن کی بے مثال قربانیوں پر اپنا فن بھی قربان کرنے کو بخوشی تیار۔

ہیں مبارک باسعادت تیری مٹی کے ذرّے
ہوئی خونِ شہیداں سے جب اس کی نمود

نثار تیرے عَلم پر اے میرے پیارے وطن
تیرے ترانے کی دھن میں ہو دفن میرا وجود

تعلیم اِنسان کو معاشرے میں بہتر کردار کیلئے تیار کرتی ہے اور اِس تعلیم کا حصُول تعلیمی اداروں میں ہی ممکن ہوتا ہے لیکن بد قسمتی سے ہمارے تعلیم اِدارے بھی دہشت گردوں کی منفی سرگرمیوں سے محفوظ نہیں۔ ہمارے تعلیمی اِدارے دہشت گردوں کی ہِٹ لسٹ پر ہیں۔

وہ تعلیمی ادارے جن کا مقصد طالب علموں کو اعتماد دینا تھا آج وہ اپنے ہی اِدارہ میں آتے ہوئے ڈر، خوف کا شکار ہیں۔ اُن کے اِداررروں کی چار دیواری کو کانٹے دار تاروں سے محفوظ بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ سیکیورٹی کیلئے کیمرے نصب کئے جاتے ہیں۔ سکوُل، کالج اور یونیورسٹی کی سطح تک اجتماعی پروگرامز، فن فیئر، اینوَل فنکشن حتیٰ کہ صبح کی اسمبلی تک کو معطل کر دیا گیا۔ اِن تمام احتیاطی تدابیر کے باوجود سانحہ پشاور آرمی پبلک سکول ہو جاتا ہے جس میں کم و بیش معصوم جانیں لقمہ اجل بن گئیں۔ اِس خوف و ہراس دہشت گردی اور انتہا پسندی کے ماحول میں تعلیمی اداروں کے اندر اور باہر بہر حال کئی طرح کے خطرات منڈلاتے رہتے ہیں۔ جہاں تعلیمی اداروں میں طالبعلموں کی جان کو خطرہ ہے وہاں ساتھ ہی ساتھ اُن کے نظریات اور افکارات کو آلودہ کیا جارہا ہے اُنھیں مذہبی انتہا پسندی اور شِدت پسندانہ جذبات کی ترغیب دے کر اپنے منفی مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی کوشش بھی عروج پر ہیں۔ ضرورت اِس امر کی ہے کہ ہم اپنے تعلیمی اِداروں کی کڑی نِگرانی کریں اور کسی بھی ایسے عنصر کو جو منفی رجحانات کا حامل ہو اُسے ہمارے طالبعلموں اور تعلیمی اِداروں سے دُور رکھا جائے۔ شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں کا کمال یہ ہونا چاہئے کہ موجودہ افراتفری کے دور میں اُن کے کلام میں ایک نصیحت، ایک پیغام اور ندرُت ایسی ہونی چاہئے کہ جو نوجوان نسل کو اپنی گرفت میں لیکر اِس طرح اپنے مستقبل کا ضامن بنادے کہ وہ کسی فضول سرگرمی کا سوچ بھی نہ سکیں۔ ایسا تبھی ممکن ہے کہ ہمارا نصاب، ہمارے اساتذہ، ہماری لائبریریاں اور ہمارے اخبارات ایسا مواد چھاپیں جس سے ہمارے اِن طلباء کو منفی قوتوں اور مُلک دُشمن عناصر کو پہچاننے میں دِقت نہ ہو اور یہ اُن کی سرگرمیوں کی بھینٹ نہ چڑھیں اِس کے لئے ماں، باپ، بہن بھائیوں اور اساتذہ کا کردار بڑا ہی اہم ہو جاتا ہے۔

پاکستان میں آبادی کی ایک خاصی بڑی تعداد غربت کا شکار ہے ایسے میں بچّوں کی تعلیم ایک مسئلہ بن جاتی ہے ایسے میں دینی مدارس ایسے بچّوں کی تعلیمی ضروریات کو پُورا کرنے کے لئے سامنے آتے ہیں۔ ایک

محتاط اندازے کے مطابق پاکستان میں کم و بیش دَس ہزار سے زیادہ مدرسے طلباء کو دینی اور مذہبی تعلیم دینے میں مصروفِ عمل ہیں۔ اِن دینی مدارس میں قرآنِ حکیم، حدیث، فقہ، عربی اور دیگر دینی شعبے کے بارے میں تعلیم دی جاتی ہے۔ اِس کے علاوہ اِن مدارس میں چھوٹے بچّوں کو ناظرہ، حِفظ، تجوید اور قرآت بھی سکھائی جاتی ہے۔ ہر گلی محلے میں قائم اِن مدارس میں جدید سائنسی تعلیم کی کمی ہے اور ان مدارس کا نصاب بھی محدود، فرقہ ورانہ سوچ کو پروان چڑھاتا ہے۔ اِس سِلسلے میں پاکستان مدرسہ بورڈ نے ایک مربوط نظام اور نصاب ترتیب دیا لیکن مدرسہ بورڈ سے الحاق میں بہت سے مدارس ابھی تک تذبذب کا شکار ہیں جس کی وجہ سے مدرسہ بورڈ کے قیام کے بنیادی مقاصد ابھی تک حاصل نہیں کئے جا سکے۔ اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ مدارس کے نصاب میں ریاضی، انگریزی اور کمپیوٹر کی تعلیم شامِل ہے لیکن ان مضامین کو پڑھانے کے ساتھ ساتھ اُس سوچ کو بھی پھیلانا چاہیئے تا کہ معاشرے کے افراد میں برداشت اور مذہبی رواداری کا ماحول بن سکے۔

مُلک میں جہاں بہت سارے رجسٹرڈ مدارس ہیں وہاں اُن مدارس کی بھی کمی نہیں ہے جن کی کوئی باقاعدہ رجسٹریشن نہیں ہوئی ایسی صورتحال میں یہ انتہائی ضروری ہے کہ حکومتی سطح پر ایسے اقدامات کئے جائیں جس سے تمام مدارس نہ صرف رجسٹریشن کے عمل سے گزریں بلکہ حکومت کی طرف سے رائج مدارس کیلئے نصاب کو بھی اپنے مدرسے میں لاگو کریں۔ اس سارے عمل میں تبھی بہتری آ سکتی ہے جب وزارتِ مذہبی اُمور اور وزارتِ تعلیم ایک مکمل سروے کر کے تمام مدارس کو قومی دھارے میں شامِل کر کے اُن کیلئے نصاب، اساتذہ کے لئے تربیتی پروگرام، امتحان اور کُتب کی فراہمی کو یقینی بنائیں۔ جہاں نصاب کے مواد کو بہترین طریقے سے چُنا جائے وہاں ضروری ہے کہ طریقہ تدریس کو بھی ممکن حد تک بہتر بنا کے جدید انداز اپنایا جائے۔

تعلیم ہر بچّے کا بنیادی حق ہے۔ لوگوں کو بنیادی تعلیم کی سہولیات میسّر نہ آنے کی وجہ سے مدارس کی اہمیت اُن کی نظر میں بڑھ گئی اور ایسی صورت میں اُنھیں بچے کے مستقبل کیلئے انتخاب کرتے وقت مدارس پہلی اور آخری تعلیم، عِلمی اور مذہبی پناہ گاہ بن کر رہ جاتے ہیں۔

ہمارے دانشوروں، مفکروں اور تعلیمی ماہروں نے ایک ایسے معاشرے کے فروغ کیلئے اپنی کوششیں جاری رکھنی ہیں جہاں سب کے مذہبی، ذاتی دلچسپیوں اور روابط کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے برداشت کا ماحول اور فضا پیدا کرتے ہوئے محبّت اور بھائی چارہ کے پیغام کو مُلک بھر میں عام کرنا ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ

شہزاد نئیر اپنی نظم "قتل گاہ" میں تعلیمی اِداروں پر حملے کی مذمت کرنے کے ساتھ ساتھ دُشمنوں کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ

سُنو یہ علم کا سُورج بجھا سکتے نہیں ہو تم
اندھیرو! روشنی آتی ہے
اب جانیں بچا سکتے نہیں ہو تم

علی محمد فرشی نظم "بارود گھر میں" کنایتاً اس بات پر تاسف کا اظہار کرتے ہیں کہ امن کی تعلیم اور بارُود ساتھ ساتھ ہیں۔

بہت دیر کر دی
فرشتوں نے نیچے اُترتے ہوئے
فاختہ
اپنی منقار میں
کیسے زیتون کی سبز پتی دبائے
جہنم سے پرواز کرتی؟
فلک دُور تھا
اور بارُود گھر شہر کے وسط میں

اوصاف شیخ تعلیمی اِداروں پر ہونے والے حملوں کو آدم خور قبیلے سے تعلق رکھنے والے جہلا قرار دیتے ہیں جو اپنی جاہلیت میں اس قدر بڑھ چکے ہیں کہ تعلیمی اِداروں کو بھی حملے کا نشانہ بنانے سے نہیں چوکتے۔ اپنی نظم "آدم خور قبیلے والو" میں جو آرمی پبلک سکول پشاور کے سانحہ کے تناظر میں لکھی گئی بیان کرتے ہیں۔

آدم خور قبیلے والو
آج تو تم نے حد کر دی ہے
معصوموں کے خوں سے اپنی
پیاس بجھانے آ پہنچے تم
کم سن پھولوں، ننھی کلیوں
پر بارُود کی بارش کر دی
آج تو تم نے سفاکی کی

ھ۔ فضا اور ماحول

معاشرہ کا چَین اور سکُون اُس کے اِرد گِرد کے ماحول سے ترتیب پاتا ہے۔ جبکہ ایک فرد کا سکُون اس کے معاشرے کے ماحول اور فضا کا مرہونِ مِنت ہوتا ہے۔ اچھے اور خوشگوار ماحول میں اِنسان کی فِکری، تخلیقی، عِلمی صلاحیتیں پنپتی ہیں اور اُس میں انسان دوستی، محبّت، یگانگت، رواداری اور ایک دوسرے کے لئے فائدہ مند ثابت ہونے کے جذبات بڑھتے ہیں اور وہ اپنے گرد و پیش کیلئے فعال کردار ادا کرنے کیلئے ہمہ تن تیار رہتا ہے۔

پاکستانی معاشرہ دہشت گردی اور دہشت گردوں کے ہاتھوں توڑ پھوڑ کا شکار ہے اس افراتفری کے دور نے بداعتمادی اور غیر یقینی کی فضا کو تقویت بخشی ہے۔ معاشرے میں شِدت پسندی، انتہا پسندی، نفرت، مذہبی، دینی، سیاسی گروہی، لسانی، علاقائی، جغرافیائی بنیادوں اور معاملات میں ایک دوسرے کو برداشت نہ کرنے کے رویے نے مُلک کی مجموعی فضا کو مکدر کر دیا ہے اور یہ رجحان اِس قدر آگے بڑھتا جا رہا ہے کہ ہم اِس کو بنیاد بنا کر کسی بھی دوسرے فرد کی طرف انتہائی اقدامات اُٹھانے تک مجبور ہو جاتے ہیں۔

ہماری تو ایک پوری نسل، وحشت، خوف، ڈر، دہشت، طالبان، بم، دھماکے، خودکُش بمبار، ہلاکتیں، زخمی، شہادتیں اِس طرح کے الفاظ اور واقعات سُن سُن کر جوان ہو رہی ہے۔ اُس کے اعصاب پر اِس طرح کے الفاظ اور واقعات اثر انداز ہو رہے ہیں۔ اُس کے مستقبل، اُس کی سوچ، اُس کے نظریات، اُس کے افکار کن ارتقائی منازل سے گزر کر کون سے خیالات اور تصورات کو منفی شکل دے رہے ہیں۔ اِس نسل نے تو مسجد، مندر، چرچ، سکول، مدرسہ، گھر، بازار، ہسپتال کُچھ بھی تو محفوظ نہیں دیکھا۔ اُس نے چَین دیکھا نہ چَین کی بہاریں۔ اس نے تو مملکتِ خداداد کو سلگتا دیکھا اور دہشت گردوں کے ہاتھوں اس مُلک کے امن کو تار تار ہوتے دیکھا۔ مذہبی انتہا پسندی، شِدت پسندی، لسانی اور گروھی تقسیم نہ صِرف دہشت گردی کے واقعات کو ہوا دیتی ہے بلکہ یہ عوامل ملک میں دہشت گردی کو ختم کرنے کی جنگ میں سب سے بڑی رکاوٹ بھی ثابت ہو رہے ہیں۔

اب اگر دہشت گردی کے اثرات عام افراد پر دیکھے جائیں تو اِس کے کئی پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں۔ دہشت گردی سے وحشت، خوف، بے چَینی، اضطرابی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اِس طرح کے حالات کے و واقعات کا مسلسل سامنا کرنے سے افراد پر کئی طرح کے منفی اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ دہشت گردی سے

پیدا ہونے والے خوف سے معاشرے کے افراد میں بے یقینی، بد اعتمادی اپنے اور اپنی حکومت پر اعتماد کی فضا قائم نہیں رہتی۔ اِس دہشت اور وحشت کے ماحول میں عام آدمی ایک ایسی بے چینی کی کیفیت میں مُبتلا رہتا ہے جس سے وہ ایک ذہنی دباؤ اور تناؤ کے مرض میں مُبتلا ہو جاتا ہے۔ ایسے معاشرے میں ہیجان اور افراتفری کے رجحانات بڑھنے لگتے ہیں اِس نا یقینی کی کیفیت میں سازشی عناصر اپنے منفی مقاصد کے حصول کیلئے آگے بڑھتے ہیں اور معصوم افراد کو اپنی وحشت اور دہشت کا نشانہ بناتے ہیں۔

خوف، دہشت، وحشت اور نا یقینی کے ماحول میں افراد کو ہمّت و حوصلہ دینا، اچھے دِنوں کی اُمید دِلانا، اور اپنے مُلک کی بقاو سلامتی کیلئے قربانی کا جذبہ اُبھارنا، شعراء، صحافی، اساتذہ اور معاشرے کے ہر طبقے کا کام ہے۔ شاعر اور صحافی اپنی مثبت اور حوصلہ افزا تحریروں سے عوام کو ڈٹے رہنے کی تلقین اور صبر سے اپنے کاموں کو جاری رکھنے کے عزم کو دُہراتے تا کہ اِس دہشت، وحشت، خوف اور ڈر کے ماحول کو دِلوں میں جگہ نہ بنانے دِی جائے۔ اس ضمن میں نظم کے شعرا نے اپنی کاوشوں سے اس نازک صورتحال کے پیشِ نظر ایسی نظمیں تخلیق کی ہیں جن میں مُلک سے محبّت کا جذبہ، دُشمن کے ہر وار کا دلیرانہ مقابلہ کرنا، اور یہ عزم کہ وہ دِن دُور نہیں جب مُلک اِن تمام عناصر سے پاک ہو جائے گا۔

شاعر بم بارود، لاشیں خون،، زخمی افراد، چیخ پکار سب دیکھ سُن کر چُپ نہیں رہ سکتا۔ اُس کا ردِ عمل لفظوں اور حرفوں کا ایک امتزاج لئے ہوتا ہے جو اِن تمام واقعات کی ایسی تصویر کشی کرتا ہے کہ فضا دور ماحول، دیر تلک افسردہ اور غمگین رہتا ہے۔ شاعر نظم کی شکل میں شہر آشوب تحریر کرتا ہے اور اپنے دور کا نوحہ بھی لکھتا ہے۔ وہ ہر طرف اُٹھتی ہوئی لاشوں کو اپنے جذبات، احساسات اور الفاظ کا کندھا دے کر اپنی مٹی کا حق ادا کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ اس مٹی کی بدولت ہی اُس کا وجود برقرار ہے۔ نظم "شہدائے وطن کی نذر" کا یہ بند اِسی بات کی مثال ہے۔

یہ لالہ و گل، یہ رنگِ چمن
یہ سنبل و ریحاں، سرو سمن
یہ ان کی مہک، یہ ان کا پھبن
سب تیرا ہی صدقہ، تیری لگن
اَے فخرِ وطن، اَے شانِ سپاہ
بحکمِ خدا، تُو اَمر ہوا

شہزاد نئیر معاشرے میں موجود خوف، ڈر، وحشت، ظلم اور بربریت کو نظم "خود کش" کا موضوع بناتے ہیں دراصل معاشرے کی فضا اور ماحول کی عکاسی ہے جس کی وجہ سے بم ، بارُود، خون، لاشیں اور اندرونی غم واندوہ ہے۔

آج بھی خون کی ندی میں نہایا سُورج
آج پھر اس کی شعاعوں نے لہو کاری ہے
رنگ سب ایک ہی کایا میں ڈھلے جاتے ہیں
دشت و دل ایک ہی منظر میں چلے جاتے ہیں
ہر جگہ ایک سی گل کاری ہے
آنکھ پر دید بہت بھاری ہے

روش ندیم فضا و ماحول کی سراسیمگی کو اپنی ذہن میں بڑھتا ہوا محسوس کرتے ہیں وہ فضا و ماحول جس میں ایک عام آدمی کے لئے محض ڈر اور خوف کی علامتیں اور نامعلوم حادثے کے وقوع پذیر ہونے کے خدشات ہیں۔ اپنی نظم "ذہن کا پی سی ون" میں انہی جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔

یہاں باغ کے اُس طرف تھوڑی جگہ خالی ہے
برائے تحفظ جہاں ایک دیوار سی چُن رکھی ہے
مگر پھر بھی آسیب
وحشی درندوں کی صورت ہمیشہ پھاند کر آتے جاتے ہیں

ماحول کے پیش نامے میں کشور ناہید کا بے باکانہ اظہار فضا میں رائج نہ صرف اپنے دل کا کرب بیان کرتا ہے بلکہ بین الاقوامی سیاسیات کا طنزیہ جنازہ بھی نکالتا ہے۔ کشور ناہید کی خوبی ہے کہ وہ جرات اظہار رکھتی ہیں اور بڑی طاقتوں اور ان کے رہنماؤں کو بھی اُن کی غلطیاں بتانے سے نہیں چوکتیں۔ نظم "امریکی بھینسے" میں وہ اسی قسم کے خیالات بیان کرتی ہیں۔

کہ، دانا کے نیک محمد کی طرح
انٹرنیٹ، میڈیا اور ہر حرف
خون آلودہ ہے
لگتا ہے خدا نے بھی تہذیب کو
کفن پہنا دیا ہے

کوئی تو بتاؤ جب سارے زمانے پے

بش حاوی ہو تو

مجھے میرے خوش گوار خواب

کہاں ملیں گے ؟

طلعت اخلاق احمد کے الفاظ بہت واضح طور پر ماحول کی چیرہ دستیوں کو بیان کرتے ہیں۔ وہ اپنی نظم "کراچی کا المیہ" میں خود کو ایک انجانے خوف کی کشمکش میں ڈوبتے ہوئے محسوس کرتی ہیں اور وہ خوف یہ ہے کہ دہشت گردی کے تعفن زدہ ماحول میں گھر سے نکلنے والا ایک عام آدمی ناجانے واپس لوٹ پائے گا یا نہیں۔

گولیوں کا موسم ہے

ایمبولینس چیختی ہے

گھر سے جب نکلتے ہیں

سوچتے ہی رہتے ہیں

زندگی کی مٹھی سے آج جانے کیا نکلے

وصل کی بشارت یا ہجر کا ہے پروانا

گھر کو لوٹ پائیں گے ؟

جواز جعفری ماحول کی منظر کشی میں جو الفاظ بیان کرتے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر ایک لمحے کے لئے بھی اس ماحول اور فضا سے کٹا ہوا نہیں ہے۔ اس پر کسی لمحے مسلط ہونے والی موت کے خوف کے ساتھ ساتھ بستیوں کے اُجڑنے کا دُکھ بھی پنہاں ہے۔ وہ مایوسی کا شکار ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح معاشرے کا ایک عام آدمی ہے۔ نظم "زمین کے نئے جنم کا گیت" اِسی قسم کے خیالات کی عکاس ہے۔

یہ کیسی زِندگی ہے

کہ موت کا خیال

ایک لمحے کے لئے بھی دل سے محو نہیں ہوتا

میری بستیوں پر

آسماں سے سراسیمگی برس رہی ہے

اور خوف سے ماؤں کی چھاتیوں کے مشکیزے

سُوکھ چکے ہیں

ارشد معراج بھی اس فضا سے اپنے آپ کو ماورا خیال نہیں کرتے۔ فضا میں رچے بچے سوگ کی وجہ سے اُن کی زبان لکنت زدہ ہو چکی ہے۔ اُن کی باتوں میں قنوطیت اور خلیوں میں اُداسی رقص کرتی دِکھائی دے رہی ہے۔ وہ خود کو بحیثیت شاعر اس ماحول کے بیان میں بے بس پاتے ہیں۔

کینوس پر پھیلی اُداسی
عجیب یہ سوگ واری ہے
تھکن پر اعصاب طاری
زبان لکنت زدہ، باتیں قنوطی پھول پژمُردہ
اُداسی خلیوں میں مسلسل رقص کرتی ہے
ہماری نظم کی ہر سطر میں تنہائی روتی ہے

و۔ ردِ عمل

شاعر اپنے خیالات میں گرد و پیش کو کبھی ذاتی دُکھ کی سان پر چڑھا کر داخلی تجربے اور کیفیت کے ملے جُلے رجحانات کو خارجی عوامل کی تلخی کے ساتھ اس انداز میں پیش کرتا ہے کہ وہ اجتماعی غم، دُکھ، غصے اور جذبات کا ترجمان بن کر سامنے آتا ہے اور وہ ایک ایسے معاشرے کا ردِ عمل کہلاتا ہے جو تقریباً دو دہائیوں سے اپنے دُشمنوں سے یوں نبرد آزما ہے کہ اس جنگ میں اُن کے پاس کامیابی کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

شِدت جذبات میں شاعر اپنی نظم کو کبھی اصلاحی رُخ دیتا ہے اور کبھی جذبات کی سلگتی آگ ٹھنڈی پڑتی ہے تو وہ سیاسی، معاشی، معاشرتی، اخلاقی اور دینی حل سوچنے لگتا ہے۔

شِدتِ جذبات میں شاعر اپنے قلم کو کبھی نشتر کبھی تلوار کی صورت تلخ الفاظ کے وار کرتے ہوئے ملک دُشمن قوتوں کو للکارتے ہوئے اپنی قوم کے ہر فرد کے عزم اور بلند ہمتی تعریف کرتے ہوئے اُن پر باور کراتا ہے کہ تمہیں معلوم ہی نہیں کہ تم نے کس قوم سے ٹکر لی ہے جو مُلک، قوم اور اپنی ملی ناموس پر جانوں کے نذرانے پیش کرنے میں پیش پیش رہتی ہے۔ شاعر کا "موضوع سُخن" ہر فرد کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے اِسے کبھی معصوم بچوں کی دُنیا میں مسکراہٹیں بکھیرتے ہوئے کسی حادثے کی صورت اُسے نمناک کر دیتا ہے اور کبھی فوج اور پولیس کے نوجوانوں کو دہشت گردی کا نشانہ بنتے ہوئے ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کی سسکیوں اور آہوں کی صورت اپنی نظم کا مرکزی موضوع بنا کر پیش کرتا ہے۔

ادب کی ہر صنف میں دہشت گردی کے موضوع پر ہمیں کئی کئی تخلیقات ملتی ہیں۔ اس ضمن میں نظم کو یہ ملکہ حاصل ہے کہ اس میں سب سے زیادہ تنوع، الفاظ کا ذخیرہ (Diction)، موضوعات اور موضوعات کی وسعت موجود ہے۔ اس میں ادیبوں اور شاعروں نے دہشت گردی، انتہا پسندی، کو ہر ایک زاویے سے احاطہء تحریر میں لا کر اس کی نہ صرف خدمت کی ہے بلکہ اس طرح کے واقعات میں ملوث افراد کو اِنسان اور انسانیت کے دشمن قرار دے کر اُنہیں اِس گھناؤنے کھیل سے دُور رہنے کی تلقین کرتے ہوئے اُن پر یہ باور کراتے ہیں کہ نفرت کی جو آگ وہ جلا رہے ہیں اس میں اُن کے گھر بھی محفوظ نہیں رہیں گے۔

شاعروں نے جہاں اپنے وطن، اپنی مٹی اور دیس سے وفا کا عہد نبھانے کی ٹھانی ہے وہاں وہ اُس وحدت کو بھی خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں جو اس مُلک کے لئے ایک نظریہ، ایک فلسفہ کا کام کرتی ہے اور وہ ہے دینِ اسلام۔

دہشت گردی، شدت پسندی، مذہبی انتہا پسندی کی جنگ صرف دفاعی ادارے، پولیس اور قانون نافذ کرنے والے اِدارے ہی نہیں لڑ رہے بلکہ پوری قوم اور اِس قوم سے تعلق رکھنے والا ہر بچہ اور بوڑھا جذباتی طور پر اِس جنگ میں شامل ہے اور وہ اپنی قوت اور صلاحیت اس جنگ کو جیتنے کے لئے بروئے کار لا رہا ہے۔ شعرا نے ہمدردی کے رویے اور آپس میں محبت اور اُلفت کو عوامی رنگ دے کر پیش کیا ہے اس طرح کے ادبی رویے اور تخلیقی کاوش کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ایسی نظم یا فن پارے کو عوامی رنگ مل جاتا ہے جس سے قوم کی ایک ملی اور اجتماعی یگانگت اُبھر کر سامنے آتی ہے جس سے اتحاد مخالف قوتوں کے حوصلہ کو شدید ٹھیس پہنچتی ہے۔ اِن نظموں کو پڑھ کر شاعروں کے ادبی رجحانات، ہمدردی اور محبت کے پیغامات، شاعرانہ گداز سے بھری سطریں، برداشت کے ماحول اور فضا کو پروان چڑھانے کی کوششوں، کو سراہا جانا چاہیے تاکہ شاعر، صحافی، ادیب اپنے اپنے محاذ پر دہشت گردی کی جنگ، میں ڈٹے رہیں۔

امن کی آشا بھی شاعروں کا ہر دلعزیز موضوع رہا ہے۔ ہمارے شاعر حضرات پڑوسی ممالک کے ساتھ اچھے دوستانہ مراسم چاہتے ہیں۔ اس لحاظ سے اخبارات اور رسائل میں امن کی آشا کے طور کے تحت بہت سی فلمیں تخلیق کی گئی ہیں۔ جن کا مقصد پڑوسی ملک بھارت سے ایسے ہمسایانہ تعلقات قائم رکھنا جس سے دونوں اطراف کے عوام کے لئے خوشی، مسرت اور سکون کا باعث بن سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ شعرا کی اپنی مٹی سے محبت اور انتقامی جذبہ بعض دفعہ شاعر کے امن پسند خیالات پر غالب آجاتا ہے اور دشمن کو اُس کے منفی پروپیگنڈوں کا منہ توڑ جواب دینے کا اِرادہ ظاہر کرتا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ اس بات کا قائل ہے کہ جنگ ٹلتی

رہے تو بہتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر کبھی تو رجائیت بھرے لہجے میں ماحول کے سدھار کا حل تلاشتا ہے لیکن جب کبھی اس کی امن اور صلح جوئی کی کوششیں دہشت گردانہ حملوں اور خود کش بمباروں کے بم پھوڑنے سے دم توڑنے لگتی ہیں تو وہ قنوطی ردِ عمل کا بھی اظہار کر دیتا ہے اور پھر طرح طرح کے سوالات اُٹھانے لگتا ہے۔ خالد احمد کے بقول:

یہ کس نے آبِ رواں چادروں میں باندھ لیا
زمیں پہ کس نے زمیں کی حدود ٹھہرالیں
یہ کس نے مجھ پر میرا خون تک اُنڈیل دیا ہے
یہ سُرخ رُو میرے غارت گروں کے ساتھی ہیں
کہ جن کی زر کی طلب، بے سزا، نا چھوٹے گی

میثم علی آغا کا ردِ عمل اس قدر شدید ہے کہ وہ ترکِ دُنیا کو مقابلے کی نسبت ترجیح دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کا کشیدہ حالات پر قنوطی ردِ عمل سوچ کو تالے لگانے کی درخواست کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اُن کی نظم "سوچنا چھوڑ دو" اسی بیانیے کی ایک جھلک ہے۔

زندگی چاہتے ہو تو
ذہنوں کو تالے لگا کر جیو
گونگے، بہرے رہو
جو بھی ہوتا ہے ہوتا دیکھ کر چُپ رہو
اور بہتر تو یہ ہے کہ چاروں طرف
دیکھنا چھوڑ دو
کون قاتل ہے اور کون مقتول ہے
سوچنا چھوڑ دو

بعض اوقات یہ ردِ عمل جذباتی رنگ اختیار کر لیتا ہے اور اربابِ اختیار کی مصلحت آمیز خاموشی کو سمجھنے سے قاصر ہو کر شدید صورت میں شعری روپ دھارتا ہے۔ جیسا کہ سدرہ سحر عمران کی نظم "بلت کار" سے ظاہر ہوتا ہے۔ جس میں شاعرہ خون کی بدبُو کو موت کے کافور کی خوشبو اور خود کش حملوں کو حرام کاریوں سے مماثل قرار دیتی ہیں۔ اور اِن حملوں کی مذمت میں شدید ہیجانی الفاظ کا استعمال کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

سُرخ رنگ۔۔۔

جن کی عزت پر سوالیہ نشان بن جاتا ہے
وہ جمعے کے ہر مبارک دن
مسجدوں اور امام بارگاہوں میں
یہی رنگ چھڑکتے ہیں
تو کافور کی بُو دُور تک پھیل جاتی ہے
لوگ۔۔۔
خود کش بمباروں کو
ان حرام کاریوں پہ کیوں نہیں ٹوکتے
جب وہ سرِعام زندگی سے
زِنا بالجبر کرتے ہیں !!

نصیر احمد ناصر کا ردِ عمل اس وقت قنوطیت کی رِدا اوڑھ لیتا ہے جب وہ چشمِ تصور سے اُن مناظر کو دیکھتے ہیں کہ دھماکہ ہونے والا ہے اور اُس کے بعد کے حالات کیا ہوں گے ؟اپنی نظم "بون فائر" میں وہ ایسے ہی مناظر کی تصویر کشی کرتے ہیں۔

ایک جھماکہ ایسا ہو گا
سڑکیں اور فٹ پاتھ جلیں گے
مرنے والے، مارنے والے
سب اک ساتھ جلیں گے
کہتے ہیں سر بچ جائے گا
ٹانگیں، بازو، ہاتھ جلیں گے

روش ندیم کا حالات و واقعات کے تناظر میں کیا گیا ردِ عمل علامتی پیرائے میں ہے۔ وہ بڑی طاقتوں کی کارستانیوں پر علامتی انداز میں طنز کرتے ہیں اور دُنیا کے بدلتے ہوئے منظر نامے کو شیطانی منظر نامہ قرار دیتے ہیں۔ اُن کی نظم "شیطان نیوز کی ہیڈ لائنز" حالاتِ حاضرہ کا دلچسپ علامتی تبصرہ ہے۔

گو تم نے نروان کی تلاش میں امریکہ دریافت کر لیا
فرعون کی طرف سے ریفرنڈم کروانے کی یقین دہانی
یسوع نے نئے عہد نامے پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا

ابلیس کی طرف سے خدا کے ساتھ بیک ڈور ڈپلو میسی کا ایک اور دعویٰ

جواز جعفری اس بربریت زدہ ماحول میں یاس کے کانٹوں کو دیکھنے کی بجائے امن کے پھول کھلانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ اس بات کے متقاضی ہیں کہ پہلے سے تباہ و برباد ہو جانے والے شہروں کے مکینوں کی غمزدگی کے دور کرنے کا واحد راستہ یہی ہے کہ شعرا اپنے کلام میں مایوسی اور نفرت کا اظہار کرنے کی بجائے امن اور آنے والے سہانے دِنوں کی اُمید کا پرچار کریں۔ اپنی نظم "آؤ موسم سے مصافحہ کریں" میں انہی خیالات کے تانے بانے بنتے ہیں۔

آؤ بنجر ہونٹوں پر مسکانیں بوئیں
آخر ہم پر اس خاک
اور بچوں کا بھی تو حق ہے
وہ ہمیں اُمید بھری نظروں سے
دیکھ رہے ہیں!
چلو بدگمانی اور وسوسوں سے پُر
نصف صدی کو بھول جائیں
اور آنے والے دِنوں کے گلے میں ہار ڈالنے کے لئے
مل کر پھول کاشت کریں

شاعر حبس زدہ ماحول میں اکثر حساسیت کا شکار ہو جاتا ہے اور جب اُسے معاشرے کی فضا میں بہتری کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو وہ اپنے افکار سے معاشرے کو تبدیل کرنے کے اقدامات کرتا ہے۔ لیکن حرف ناشناس جب شاعر کے افکار کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں تو ایک ردِ عمل ایسا بھی سامنے آتا ہے کہ شاعر شاعری ہی سے متنفر ہو جاتا ہے اور اس سے کنارہ کشی اختیار کر لیتا ہے۔ یا پھر وہ شاعری سے فرار حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ایسا ردِ عمل بہت شدید ہوتا ہے لیکن چاہتے ہوئے بھی شاعر ایسا نہیں کر سکتا۔ کیونکہ شاعری تو شاعر کی رگ و پے میں خون کی طرح بہتی ہے۔ وہ اس سے کٹ کر نہیں رہ سکتا۔ کشور ناہید کا ایسا ہی ردِ عمل نظم "دوراہا" میں ہمیں ملتا ہے۔

میں نے شاعری سے کہا
میری تمہاری دوستی اب ختم

کہ میں تمہارے ساتھ رشتہ نبھاتے نبھاتے

ریزہ ریزہ بکھر رہی ہوں

میں اب تم سے کوئی وعدہ نہ کروں گی

اُردو نظم کے سرمایہ کا دہشت گردی کے تناظر میں مطالعہ، موضوعات کی وسعت کے علاوہ یہ بات بھی بیان کرتا ہے کہ شعرا نے حالاتِ حاضرہ، ملکی اور غیر ملکی سیاست، دینی مکتبہء فکر اور آزاد خیال افراد، ہر ایک کے نقطہء نظر کی عکاسی کی ہے۔ جہاں ایک طرف پاکستانی معاشرہ دہشت گردی کے واقعات کو سہنے کا عادی ہو چلا ہے وہیں اُردو نظم کا شاعر بھی آئے دِن کے بم دھماکوں، خودکش حملوں اور دہشت گردی کے واقعات کا کسی نہ کسی شکل میں شکار ہونے پر اِس نتیجے پر پہنچ چکا ہے کہ اِس ناسُور کو اِس خطے سے ختم کرنے کے لئے ہمیں ہر محاذ پر سینہ سپر ہونا پڑے گا۔ بالخصوص ادیبوں، دانشوروں اور شاعروں کو اپنی تخلیقات کے ذریعے ایک پُرامن پاکستان کی وعید سنانی ہے۔

حوالہ جات:

1- وزیر آغا، ڈاکٹر، نظمِ جدید کی کروٹیں، سنگت پبلیشرز، لاہور، 2013، ص 17

2- ایضاً، ص 24

3- ضیاالحسن ڈاکٹر، جدید اُردو نظم کا آغاز و ارتقا، بیکن بکس لاہور، 2012، ص 84

4- طارق ہاشمی، اُردو نظم اور معاصر انسان، پورب اکادمی، اسلام آباد، 2015، ص
113

5- الیاس میراں پوری، جدید شعری روایات، بیکن بکس، 2012، ص 153

6- احمد ندیم قاسمی، ارض و سما، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2007، ص 83

7- کشور ناہید، ادبی سلسلہ، دُنیازاد، کراچی، شمارہ 10، ص 267

8- جواز جعفری، موت کا ہاتھ کلائی پر ہے، فکشن ہاؤس، لاہور، 2005، ص 22

9- نصیر احمد ناصر، تیسرے قدم کا خمیازہ، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، 2013، ص 54

10- کشور ناہید، وحشت اور بارود میں لپٹی ہوئی شاعری، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور،
2009، ص 57

11- www.facebook.com/ausafsheikh، 2 جون 2017،
10:25 pm

12- www.facebook.com/shouqansari، 12 دسمبر 2013،
7:05 am

13- www.facebook.com/ayeshabaigashi، 13 ستمبر 2016،
4:34 am

14- فاخرہ بتول، اُسے روکتے بھی تو کس لئے، ہانی پبلی کیشنز، ملتان، 2012، ص 34

15- خالد احمد، ماہنامہ بیاض، لاہور، شمارہ مئی 2016، ص 76

16- امجد اسلام امجد، یہیں کہیں، جہانگیر بک ڈپو، لاہور، 2006، ص 75

17- ایضاً، ص 99

۔ جواز جعفری، موت کا ہاتھ کلائی پر ہے، فکشن ہاؤس، لاہور، ، ص

۔ تنویر دانش، خواب کے درد انوکھے، رو میل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی،

، ص

۔ نصیر احمد ناصر، تیسرے قدم کا خمیازہ، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ، ص

۔ نصیر احمد ناصر، ملبے سے ملی چیزیں، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ، ص

۔ www.facebook.com/naveedmalik، دسمبر

am،

۔ ماہنامہ ھلال، راولپنڈی، شمارہ، جلد، جون ، ص

۔ ایضاً، ص

۔ ماہنامہ ہلال، راولپنڈی، شمارہ، جلد، فروری ، ص

۔ ماہنامہ ہلال، راولپنڈی، شمارہ، جلد، اگست ، ص

۔ www.facebook.com/shahzadnayyar، مارچ ،

am

۔ علی محمد فرشی، زندگی خودکشی کا مقدمہ نہیں، راولپنڈی، ، ص

۔ www.facebook.com/ausafsheikh، ستمبر، ،

am

۔ خواجہ اصغر پرے، ماہنامہ ھلال، شمارہ، جلد، دسمبر ، ص

۔ www.facebook.com/shahzadnayyar، مارچ

am،

۔ روش ندیم، وحشت کے موسم میں لکھی نظمیں، ریڈنگ پبلیشنرز، لاہور، ص

۔ کشور ناہید، وحشت اور بارُود میں لپٹی ہوئی شاعری، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ،

ص

طلعت اخلاق احمد، گمشدہ سُر، کینوس کمیونی کیشنز، کراچی، ص
جواز جعفری، موت کا ہاتھ کلائی پر ہے، فکشن ہاؤس، لاہور، ص
ارشد معراج، کتھا نیلے پانی کی، بہزاد پبلیشرز، راولپنڈی، ص
خالد احمد، ماہنامہ بیاض، لاہور، شمارہ مئی ص
میثم علی آغا، ماہنامہ بیاض، لاہور، شمارہ اگست ص
www.facebook.com/sidrasaherimran،
مارچ pm،
نصیر احمد ناصر، ملبے سے ملی چیزیں، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ص
روش ندیم، دہشت کے موسم میں لکھی نظمیں، ریڈنگ پبلیشرز، لاہور، ص
جواز جعفری، موت کا ہاتھ کلائی پر ہے، فکشن ہاؤس، لاہور، ص
کشور ناہید، وحشت اور بارُود میں لپٹی ہوئی شاعری، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص

باب سوم: اُردو نظم پر دہشت گردی کے اثرات بلحاظ اصنافِ نظم

اُردو نظمیہ شاعری نے دہشت گردی اور اس سے متعلقہ موضوعات کو جہاں انفرادی اور اجتماعی موضوعات کے حوالے سے تلامذہ خیال میں لایا ہے اور انفرادی دُکھ اور ردِ عمل، فضا و ماحول، اِداروں اور جذباتیات اور نفسیات کو منفرد حوالوں سے چھوا ہے وہیں پر متعلقہ موضوع نے اُردو نظم کی اصناف پر بھی اپنا تاثر چھوڑا ہے۔

اس باب میں ہم اُردو نظم کے متعلقہ موضوع کے حوالے سے اصناف پر پڑنے والے اثرات یعنی اُن میں ہونے والی تبدیلیوں یا اضافوں کو دیکھیں گے۔

الف۔ بچّوں کی نظمیں

بچّوں کی نظمیں اُردو شاعری کا بڑ آثاثہ ہیں۔ بچّوں کی نظمیں اپنے عنوانات کے لحاظ سے بڑی دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔اِس ضمن میں علامہ اقبال، اسمٰعیل میر ٹھی، حفیظ جالندھری، محمد اسد اللہ، صوفی غلام تبسّم، افسر میر ٹھی، کِشوَر ناہید کے نام قابلِ ذِکر ہیں۔اِن شعرا نے سیدھے سادھے, آسان اَور واقعاتی طرز کے موضوعات لے کر نظمیں تخلیق کی ہیں۔ جن میں کسی حد تک مزاح کا عنصر نمایاں ہے۔ ان نظموں کی زبان آسان اور سادہ ہے۔ اکثر نظمیں مختصر ہیں اور چھوٹی بحر میں لکھی گئی ہیں۔ ان نظموں کے موضوعات زیادہ تر پرندوں، جانوروں، موسموں اور کسی خیالی کردار سے متعلقہ ہیں جیسے بندر، بطخ اور سانپ، بلّی، چڑیا اور کوئل، پہاڑ اور گلہری، ہمدردی وغیرہ۔ بچّوں کا ادب اور خاص کر بچّوں کی نظمیں تخلیق کرنا ایک دشوار تخلیقی تجربہ ہے کیونکہ کسی منظر، کسی واقعے یا موسم کی شِدت کو بچّوں کی سطح پر آکر دیکھنا اور محسوس کرنا ہوتا ہے اور پھر اُس کو بیان کرنے میں الفاظ، تشبیہات اور تراکیب بھی ایسی استعمال کرنی پڑتی ہیں جو اُس مخصوص عُمر کے تقاضوں کے مطابق ہو۔ بہت زیادہ سنجیدہ اور روکھا موضوع بچّوں کی نظموں کے لئے چننا اور اُس پر طبع آزمائی کرنا بہت مناسب خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ لیکن گزشتہ دو دہائیوں میں مُلک جس افراتفری اور بے یقینی کے دور سے گزر رہا ہے اُس نے بچّوں کیلئے تخلیق کی گئی نظموں میں بھی ہمیں دہشت وحشت، بم بارود، خون اور موت سے متعلقہ منظر نامے بہت واضح ملتے ہیں۔ ایسے میں تخلیق کی گئی نظمیں جہاں سہمے ہوئے بچّوں کے خیالات اور وسواس کی عکاسی کرتی ہیں وہاں شاعروں نے اِن پھولوں کو نفرت کی سیک دے کر جُھلسانے والوں کو بھی پیغام دیا ہے کہ پُھول تو اپنا رنگ اور خوشبو بِلا تفریق بکھیرتا ہے وہ تو محبّت ہی محبّت ہے اُسے تو نفرت کا پتہ تک نہیں پھر اُسے کیوں اپنے انتقام کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔

معصوم بچّے اپنی روشن آنکھوں میں آنے والے اچھّے دِنوں کے خواب سجائے اپنے بستے میں رکھی گئی کتابوں سے مستقبل سنوارنے کے خواہاں ہوتے ہیں کہ اچانک کِسی وحشی درندے کی وحشت کا نشانہ بن کر بم، بارود اور دھوئیں کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اُن کا زخمی چہرہ، جُھلسی ہوئی کتابیں، جلا ہوا بستا اور ٹوٹا ہوا قلم۔ سب اُن کے خوابوں کی طرح بکھرے پڑے ہیں اور شاعر اپنے جذبات کو حواس کے تابع رکھتے ہوئے اُس دور کا نوحہ طالبعلموں کی زبانی لکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کہیں شاعر کا قلم روشنائی کی صورت یوں آنسو بہاتے ہوئے مِلتا ہے کہ باپ تو ننھے / ننھی کیلئے آئسکریم، کھلونے، مہندی، چوڑی لینے بازار تک گیا تھا اور لوٹنے میں اتنی تاخیر کیوں؟ وہ معصوم اپنی خواہشیں بھول گئے اُنھیں اپنے کھلونوں، آئسکریم، مہندی نہیں چاہیئے اُنھیں تو بابا کا

سینہ چاہیئے جس پر وہ سَر رکھ کر لوری سُنتے ہوئے سو جائیں لیکن بابا تو خود کسی بم دھماکے کا نشانہ بن کر ابدی نیند سو چکے ہیں۔

دہشت گردی، وحشت اور خوف کے اِس ماحول میں معصوم بچوں کی شخصیت پر جہاں منفی اثرات مرتب کئے ہیں وہاں اُن کے لیئے سیر و تفریح، پارکوں، بازاروں، مینا بازار، سٹالز پر سے چھوٹی چھوٹی خریداری کے تمام مواقعوں پر بھی ایک طرح کی پابندی لگادی ہے۔ بچپن کی حسیں یادیں، مکدّر ماحول نے تباہ و برباد کر دیں۔ شاعر نے بچوں کی خواہشوں کو اپنے الفاظ کی زبان دے کر ادب کا ایک نیا باب رقم کیا ہے۔ آرمی پبلک سکول کے واقعہ نے جہاں ہر شخص کو غمگین اور اُداس کر دیا وہاں شعرا نے اِس واقعہ کے مختلف پہلوؤں کو اپنی نظم میں بیان کیا۔ دُکھ دردِ، الم کی یہ کہانی بچوں اور اُن کے والدین کے لئے نہ مٹنے والے ایک سوگوار لمحہ تھا۔ اِس واقعہ پر کئی طرح کی نظمیں اور گیت لکھے گئے جن کا تفصیلی ذکر آنے والے صفحات میں ملے گا۔ اِسی طرح اعتزاز احسن، شہید کی دلیری اور جرات مندی کو بھی اپنے اپنے انداز میں خراجِ تحسین پیش کیا گیا، وہ ننھا طالب علم جس نے دہشت گردوں کو قابو کر کے اپنے سکول کو تباہی سے بچایا۔

امجد اسلام امجد زخم میں تڑپتے اور خون میں لتھڑے بچوں کو ایڑھیاں رگڑتے مرتے نہیں دیکھ پاتے اور ان بچوں کی تیز چیخوں کی آوازیں اپنے کانوں میں گونجتی محسوس کرتے ہیں۔ اپنی نظم "میں نوحہ گر ہوں" میں بیان کرتے ہیں۔

میں نوحہ گر ہوں
میں اپنے چاروں طرف بکھرتے ہوئے زمانوں کا نوحہ گر ہوں
میں آنے والی راتوں کے دامن میں عورتوں کی اُداس بالیوں
کو دیکھتا ہوں
اور ان کے بچوں کے تیز چیخوں کو سن رہا ہوں۔

.امجد اسلام امجد ملبے کے نیچے دبے بچوں کی صدائیں بھی سننے پر اہلیت رکھتے ہیں اور بے گور و کفن دفن ہونے والے بچوں کو بے نشاں ہوتا نہیں دیکھ سکتے۔ اپنی نظم "مہلت" میں وہ ایسی گھڑی پر معترض ہوتے ہیں کہ جس میں سنبھلے کی مہلت بھی نہ مل سکے۔

لیکن جو قیامت کا سماں آج یہاں چاروں طرف ہے
ایسا تو کسی نے کبھی دیکھا نہ سنا تھا

ملبے میں دبے چیختے بچوں کی صدائیں
یوں کان میں آئیں
جیسے کوئی برچھی ہو ہر اک حرفِ نوا میں
آنکھوں میں ہم امید نہ تاثیر دُعا میں
بے گور و کن لاشوں کی تدفین کرے کون
شکل ہے یہاں ڈھونڈنا بستی کا نشاں بھی۔

ایسے کرب اور غمزدہ ماحول میں امجد اسلام امجد کو ان ننھے بچوں کے مرنے کا یقین ہونا ناممکن دکھائی دیتا ہے۔ وہ انہیں مردہ تصور کر ہی نہیں سکتے اور انہیں ایسا پھول قرار دیتے ہیں جو مسلا تو جا چکا ہے لیکن خوشبو سے خالی نہیں ہوا۔ وہ بچوں کے لئے زندگی ان کے بھائیوں، بہنوں اور باقی رہ جانے والی یادوں میں تلاش کرتے ہیں۔

امجد کے ہاں اس بات کا احساس بھی ملتا ہے کہ ان بچوں نے زندگی قربان کر کے دراصل لوگوں کے دلوں میں اپنے آپ کو امر کر لیا ہے اور ان کی یاد کو دل سے نکالنا کسی بھی حساس دل رکھنے والے وطن کے باسی کے لئے ممکن نہیں۔ اپنی نظم "شہدائے پشاور کے بچوں کے لئے" میں لکھتے ہیں:

کل تک تھے بس اپنے گھر کے باسی تم
اب ہر اک گھر میں بستے ہو
تم زندہ ہو
اے میرے وطن کی شہزادو تم زندہ ہو
خوشبو کے روپ میں اے پھولو تم زندہ ہو
جب تک دنیا باقی ہے تم زندہ ہو
تم زندہ ہو۔

کشور ناہید بچوں کے لئے لکھتے لکھتے ایک ہیجانی کیفیت کا شکار ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنا فن، اپنی شاعری، اپنی نظمیں بے کار تصور کرتی ہیں اگر ان میں بچوں کے غم، درد اور دُکھ کو شامل نہ کیا گیا ہو۔ وہ ایسی نظم کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتی کہ ان میں بچوں کی آہیں اور سسکیاں شامل کرنی پڑیں ہیں۔ اپنی نظم "فلوجہ کے دروازے پر کھڑی نظم" میں وہ اسی کرب کو بیان کرتی ہیں:

میں ان نظموں کا کیا کروں

جن میں سہمے ہوئے زخمی بچوں کے
رونے کی آوازیں گونجتی تھیں
کہ اب ہر طرف کراہیں اور آہیں
میرے کانوں کو چھید رہی ہیں۔

کشور ناہید کے ہاں اس معصوم بچے کی معصومیت کے متعلق سوائے ماں کی ممتا کی حیرت کے سوا کچھ نہیں کہ وہ معصوم بچہ جو دہشت گردوں کے ہاتھوں یرغمال بن گیا اور ان کے ہاتھوں سے بلیک میل ہو کر خود کش بمبار کے روپ میں دھماکہ کرنے نکل کھڑا ہوا ہے۔

ماں کو اس کے گھر سے نکلتے وقت یہ بھی یاد نہیں کہ وہ کس حالت میں گھر سے نکلا، ناشتہ کر کے یا ناشتے کے بغیر، کس رنگ کے کپڑوں میں ملبوس، بستہ لے کر یا بارود سے بھرا تھیلا لے کر

مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ جب تم گھر سے نکلے تھے
تو تمہارے ہاتھ میں رومال تھا
انجانے اور بے ساختہ آنسوؤں کو
پونچھنے کے لئے
کہ تھیلا تھا جس میں بارود بھرا ہوا تھا
یا تمہارے سینے پر موت نے
تمغوں کی صورت میں
ہینڈ گرینیڈ باندھے ہوئے تھے۔

جواز جعفری اقوامِ متحدہ کی بے حسی خاموشی اور ظلم و بربریت کی بڑھتی ہوئی فضا میں اپنا کردار ادا نہ کرنے کے عمل کو طنز کا نشانہ بنا کر بچوں کی محرومی کو نفسیاتی ہتھکنڈے کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور اقوام متحدہ کے اہل کاروں کو اس احساس پر قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ ان بچوں کی آہ و بکا سن کر ان کا غم غلط کرنے کے اقدامات اٹھائے۔ اُن کی نظم "یو۔ این۔ او" اسی بات کا بیانیہ ہے:

یو این او
تیری جوانی
مٹھی سے گرتی ریت
اور تیری کوکھ میں گناہ سانس لیتا ہے!

تری قراردادوں کے حروف
جنوبی ایشیا کے بچوں کی آنکھوں سے دھل گئے ہیں
اور تیرے ڈیسنگ کلب کے تقریری مقابلوں پر
سماعتیں اپنے کیواڑ بند کر چکیں!

جواز جعفری بچوں کی ہلاکتوں پر خاموش ادب کو بھی لٹارنے سے گریز نہیں کرتے اور موجودہ حالات میں سب کچھ ختم ہوتا دیکھتے ہیں۔ وہ ایسے ادب کے فروغ کے خواہ ش مند ہیں جس میں دنیا کے بڑھتے ہوئے کرب کا بیان ہو۔ خصوصاً بچوں پر ہونے والے مظالم اور اُن کی محرومیاں؛ بصورتِ دیگر اُنہیں کچھ باقی بچتا دکھائی نہیں دیتا۔ اپنی نظم "میری وصیت میری نظمیں ہیں" میں لکھتے ہیں:

ہمارے موسم
بچے
ادب
سب کچھ راکھ ہونے کو ہے
میری محبوب!
آؤان پھولوں کے لئے آنسو بہائیں۔
جنہیں جلد بکھرنا ہے۔

اپنے دل میں اُٹھنے والے اس قسم کے خیالات سے جواز جعفری افسردہ اور مایوس دکھائی دیتے ہیں اور افسوس کرتے ہیں کہ جنگ وجدل کی ہوس میں آئندہ آنے والی نسلوں اور بچوں کے لئے ہم کیا چھوڑے جا رہے ہیں۔ اپنی نظم "ایک حقیر ذرّے پر غلبہ پانے کی ہوس" میں وہ کہتے ہیں:

میرے بزرگوں نے
ایک بہتر دنیا میرے سپرد کی تھی
مگر میں ایک بدصورت
اور غیر محفوظ دنیا اپنے بچوں کے حوالے کرنے پر مجبور ہوں!

اوصاف شیخ نظم "آدم خور قبیلے والو" میں دین کے نام پہ ہونے والے مظالم برسانے والوں کو مسلمان کو کیا انسان سمجھنے کو بھی تیار نہیں۔ وہ اس بات کا تصور ہی نہیں کر سکتے کہ کوئی انسان اتنا سفاک بھی ہو سکتا ہے کہ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے معصوم بچوں کا بھی خون بہانے سے دریغ نہیں کرتا۔

اتنی گود ہی خالی کر کے
اتنے آنگن سونے کر کے
اتنے سینے چھلنی کر کے
معصوموں کے خون سے
ہولی کھیل کے بھی تم
دین کی باتیں کیوں کرتے ہو
دین کے ٹھیکے دار نہیں تم
نہیں نہیں
یہ دین نہیں ہے
انسان نہیں تم

اوصاف شیخ دہشتی واقعات کی خبروں اور مناظر کو ٹی وی پر دکھائے جانے سے ننھے بچوں پر پڑنے والے نفسیاتی اثرات پر پریشان کن داخلی تصور کشی کرتے ہیں اور اپنی بیٹی کی زبانی سوال اُٹھاتے ہیں کہ ہم اپنے بچوں کے ننھے ذہنوں پر کیا ثبت کر رہے ہیں؟ ہم اپنے بچوں کو کس طرح مطمئن کر سکتے ہیں۔ جو ملکی صورت حال کو روزانہ کی بنیاد پر ٹی وی خبروں میں دیکھتے ہیں اور والدین پر طرح طرح کے معصوم سوالات کی بوچھاڑ کرتے ہیں۔ کیونکہ ننھے بچوں کا معصوم ذہن اس پیچیدگی کا ادراک کرنے سے قاصر ہے۔ اسی کیفیت کو وہ اپنی نظم "بوسنیا" میں بیان کرتے ہیں:

میری پانچ سال کی بیٹی ٹی وی پر نگاہ ڈالتی ہے اور کہتی ہے
پتہ ہے کیا بابا! اور بابا!
یہ بچوں کو کون مارتا ہے؟
انہیں کھانا کیوں نہیں ملتا؟
اس بچی کی گڑیا کو کیا ہوا؟
تم انہیں کوئی کہانی سناؤ بابا!

علی محمد فرشی اسی موضوع کو اپنی مختصر نظم یوں بیان کرتے ہیں:

ٹی وی پر چلیں خبریں
کیوں ننھے شہیدوں کا

راہ دیکھتی ہیں قبریں۔

میجر شہزاد نیّر معصوم بچوں کے قاتلوں کو واشگاف لفظوں میں بتا دینا چاہتے ہیں کہ وہ اب بچ نکل کے جا نہیں سکتے۔ بچوں کے خون سے ہاتھ رنگنے والے، ان معصوم کلیوں کو روندنے والے بچ نہیں سکتے۔ پھول جیسے بچوں کی خوشبو ہی ان قاتلوں کے لئے سموم ثابت ہو گی۔ اپنی نظم "قتلِ گل" میں کہتے ہیں:

میرے سلے ہوئے پھولوں کی خوشبو چار جانب ہے
میرے کم سن شہیدوں کے لہو کا نور ہر سو ہے
ہمارے باغ کے پھولوں کو ملا ہے
سنو یہ علم کا سورج بجھا سکتے نہیں ہو تم
اپنی جانیں بچا سکتے نہیں ہو تم

فاخرہ بتول بچوں کی نظموں کے حوالے سے ماں کی مامتا کو بیان کرتی ہیں۔ وہ اپنی نظم "خود کش" کو مامتا کے لئے ایک خاص نظم قرار دیتی ہیں اور مامتا کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہیں۔

وہ اپنے بچوں کے زرد چہروں کو دیکھتی ہے
کبھی تو ان کو وہ چومتی ہے
کبھی وہ ان کی اُداس آنکھوں میں
گہرے فاقوں کو کھوجتی ہے
وہ سوچتی ہے
کوئی خوشی ان کو دے نہ پائی
وہ زندگی ان کو دے نہ پائی۔

فاخرہ بتول تعلیم کے لئے جانے والے بچوں کے المیے کو اپنی نظم "کیا ہم انسان ہیں؟" میں خوبصورت استعاری انداز میں بیان کرتی ہیں۔ اُن کے نزدیک بچوں اور معصوم پرندوں کی معصومیت میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اس لئے بچوں پر ہونے والے ظلم کی حمایت نہیں کی جا سکتی۔

دیکھو تو معصوم پرندوں کی آنکھوں میں، سہاہٹ ہے اور نمی ہے
ان کے گھونسلے راکھ کی صورت، انکے سینے خاک کی صورت
مت معصوم فرشتوں کے ہاتھوں سے لو گوں
قلم دوات کتابیں چھینو

ان کے کھیل کھلونوں کو بھی مت توڑو تم
مٹی میں مت رولو ان کی مسکانوں کو
جینے دو اس دھرتی پہ سب انسانوں کو۔

میجر حسان طاہر اپنی نظم "اے پی ایس پشاور کا ننھا شہید" میں ایک ننھے بچے کی زبانی تمام بچوں کے احساسات کی ترجمانی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک ایسا بچہ جس نے ابھی زندگی کی کئی بہاریں دیکھنی تھیں۔ اس نے اپنے خاندان، وطن اور اس دنیا کے لئے کئی اہم امور اور کارنامے سرانجام دینے تھے لیکن وہ ایّام طفولیت ہی میں نوچ لیا گیا۔ وہ اپنے دیس کے لوگوں سے مخاطب ہے اور کہتا ہے:

میں جو چھوٹا سا بچہ ہوں
مجھے ظلمت ڈراتی ہے
میں تنہا رہ نہیں سکتا
سو میں نے کھیل سا کھیلا
(جو میری عمر کے بچے عموماً کھیل نہ پائیں)
میں جاں کو نذر کر آیا
مگر بدلے میں ایسی روشنی لایا
جو میرے خاک کے گھر کو
وفا کے نور سے بھر دے
جو میری دو گھڑی کی زندگی تو دائمی کر دے
جو میرے بے ثمر جینے کو اتنا با ثمر کر دے
گزرتے وقت کی گردش میں مجھ کو
معتبر کر دے
مجھے اب امر کر دے
میرا جنت میں گھر کر دے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ آزمودہ پختہ کار، شعرا کے ساتھ ساتھ نو آموز شعرا نے بھی جہاں بچوں کے لیے دہشت گردی اور اس سے متعلقہ موضوعات کو اپنی شاعری کا حصّہ بنایا ہے۔ وہاں طالب علم اور بچے بھی کسی سے کم نہیں رہے۔ بری، بحری اور فضائی افواج کے نمائندہ ماہنامہ رسالے "ھلال" میں عبداللہ

اطہر جماعت ہفتم اور اس کی بہن زینب اطہر جماعت ہشتم نے مل کر ایک نظم بعنوان "شہید کی ماں" لکھی۔ جو شہیدوں کی ماؤں کے لئے ان کی جانب سے خراجِ عقیدت ہے۔

ننھے طلبا اور بچوں کا شعری ذوق نا صرف قابلِ تحسین ہے بلکہ حالیہ دہشت گردی کی لہر کو انہوں نے جس انداز سے محسوس کیا ہے اس کا اظہار بھی قابل ستائش ہے۔

میرا پیارا، بھلا سا بچہ
اللہ نے اس کی سن لی دُعا
اور کر دیا اس کا خواب سچ
یاد کرتی ہوں اس لمحہ لمحہ
بنا دیا مجھے ایک شہید کی ماں
میرا پیارا بھلا سا بچہ

تنویر دانش دہشت گردی کا شکار ہونے والے ایک شخص کی معصوم بچی کی زبانی اُس کے مرحوم باپ کی یاد کے جذبات کو بیانیہ دیتے ہیں اور جذباتی انداز میں معصوم بچے کی زبانی ہر وہ فعل اور اَمر بیان کرتے ہیں جو ایک باپ اپنی بیٹی کے ساتھ روا رکھتا ہے۔ اور بیٹی اَب اُس کی کمی محسوس کرتی ہے۔ اپنی نظم "میرے بابا آؤ کہانی سناؤ" میں وہ اسی تاثر کو باندھتے ہیں:

میرے بابا آؤ کہانی سناؤ
میرے بابا آؤ کہانی سناؤ
میری اِک شرارت پہ یوں نہ خفا ہوں
میں گُڑیا نہیں مانگتی میرے بابا
مُجھے بن بتائے نہ مُجھ سے جُدا ہوں
کھلونے نہیں مانگتی میرے بابا
مجھے اِک جھلک اپنی آ کہ دِکھاؤ
میرے بابا آؤ کہانی سُناؤ

ب۔ دُعائیہ نظمیں

اُردو میں دُعائیہ نظموں کی روایت نئی نہیں ہے۔ کئی شاعروں نے دُعائیہ نظمیں کہیں ہیں۔ دُعا میں شاعر اللہ کے حضور اپنی خواہش کا اظہار کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ قبولیت کا منتظر بھی ہوتا ہے۔ علامہ اقبال کی نظم "لب پہ آتی ہے دُعا بن کے تمنا میری" بہت ہی مقبول دُعائیہ نظم ہے۔ احمد ندیم قاسمی کی نظم "خدا کرے کہ مری ارض پاک پر اُترے۔ اس دُعا کو بھی عوامی اور علمی سطح پر بڑی پذیرائی ملی۔ اس نظم میں احمد ندیم قاسمی مُلکِ پاکستان اور اِس کے باسیوں کے لئے نیک تمناؤں اور خواہشات کا اظہار کیا ہے۔ اِسی طرح امجد اسلام امجد کی ایک نظم "حضرت عیسیٰ کی ایک دُعا" مختصر نظم ہے۔ لیکن اِس میں بھی شاعر اپنے رب سے لوگوں کی معافی کی دُعا کرتے ہیں۔ فیض احمد فیض بھی اپنے مخصوص انداز سے دُعا کرتے ہیں اور نظم "دُعا" میں اپنے وطن سے ہمدردی کا دم بھرتے ہیں۔

مجید امجد کی دو دُعائیہ نظمیں بعنوان "ایک دُعا" اَور "مریض کی دُعا" کلیاتِ مجید امجد میں شامل ہے۔ اِسی طرح پروین شاکر کی ایک نظم "انہونی کی ایک دُعا" اُن کے مجموعہ کلام "خود کلامی" میں شامل ہے۔ پروین شاکر کا دلیرانہ اقرار معاشرے سے ٹکراؤ کے بعد لطیف جذبوں کے شعروں کو جنم دیتا ہے۔ اِس نظم میں وہ معاشرتی دباؤ اور تناؤ کا شکوہ ربِ ذوالجلال سے کرتی ہیں۔

اُردو نظمیہ روایات کے ساتھ ساتھ دہشت، وحشت، ڈر اور خوف کے اس ماحول میں دُعائیہ نظموں کے مرکزی خیال بھی پہلو بدلتے ملتے ہیں۔ شاعروں نے بھی اپنی دُعائیہ نظموں میں اِس گھٹن کے ماحول سے چھٹکارے کی دُعائیں مانگی ہیں۔ کہیں تو وہ اپنے ملک و قوم کی حفاظت کے لئے ہاتھ اُٹھائے ہوئے اپنے حرفوں اور لفظوں کے موتی بکھیرتا ہے اور کبھی وہ اپنی اَور اپنے شہر کے باسیوں کی جان و مال کی حفاظت کی دُعاؤں میں سجدہ ریز ملتا ہے۔ اور کبھی وہ اپنی نظموں میں اپنے خالقِ حقیقی سے یہ التجا کرتے ہوئے دِکھائی دیتا ہے کہ میرے مولا! میرے مُلک کے اِن معصوم بچوں کو ہر طرح کی دہشت گردی اور ہر دہشت گرد آنکھ سے محفوظ رکھنا جو اِن کے خوابوں کو، اِن کے روشن مستقبل کو جھلسانہ چاہتا ہے۔ اور کہیں کہیں شاعر خُدا تعالیٰ سے شاکی بھی نظر آتا ہے۔

سید مبارک شاہ خُدائے واحد سے ایسی امداد کے طلب گار ہیں جو ماحول کے اُجاڑ کو تبدیل کر کے سلامتی کا ماحول عطا کر دے جس طرح اُس نے خوف والے شہر کو امن بخشا ہے۔ وہ خُدا سے مخاطب ہو کر اس امداد کی دُعا کرتے ہیں جو معاشرے میں پھر سے امن و سکون نافذ کر دے۔ اپنی نظم "الم ترکیف" میں لکھتے ہیں:

اَے لامکانوں کے تنہا مکیں
تیرے گھر کو گرانے جو آیا کوئی
تو پرندے پیامِ اَجل بن گئے

اَور میرے شہر میں
کتنے آباد تھے جو مکاں جل گئے
اور پرندوں کے سب آشیاں جل گئے

ربِ کعبہ تُجھے تیرے گھر کی قسم
جو سلامت رہا اور سلامت رہے
تا قیامت رہے
میرے آباد شہروں کی فریاد سُن
اِبرھٰہ کا جہاں لشکرِ فیل ہے
ہم کو پھر انتظارِ ابابیل ہے

نظم "تعزیت" میں سید مبارک شاہ کی پُکار، دہشت وحشت کے بازار کے گرم ہو جانے کے بعد جب غم کی برداشت ختم ہوتی ہے تو یہ پُکار طنز کا رُوپ دھار لیتی ہے اور خُدا سے مخاطب ہو کر اس کی خاموشی کو توڑنے کی فریاد کرتی ہے۔

کشور ناہید بھی خُدائے واحد سے شاکی لہجے میں مخاطب ہو کر اپنی دُعا کو قبولیت کا پیرایہ بناتی ہیں۔ وہ اولاً تو خُدا کی تخلیق کردہ اِس دُنیا کا مقصدِ حیات بیان کرتی ہیں اور بعد ازاں اِس مقصد میں انسانی، شیطانی صفات کی آمیزش سے پڑ جانے والے بگاڑ کا الزام خُدا کی خاموشی کو قرار دیتی ہیں۔ اور وہ اپنی نظم "یاد امنِ یزداں چاک" میں لکھتی ہیں:

دُنیا کے مقدر میں تُو نے
بارُود لکھا بندوق لکھی
وحشت کی حزیں تہذیب لکھی
کیوں گلیوں گلیوں خون بہانے والے جنّے

میں رَب لکھوں تو جنگ لکھے
میں مالک کہہ کر بُلاؤں تُجھے
تُو اُجڑے گھر دِکھلائے مجھے

اَے میرے پالن ہار
مجھے واپس کر دے
وہ دُنیا، وہ آدرش
وہ اَمن و وفا
جو میرے گھر کا گہنا ہو
تُو رَب ہے تو رَب بن کر دِکھا
سب جابر ظالم لوگوں کو بھو بھل میں ملا
ہم سب کے دامن پھیلے ہیں
تُو رَب ہے تو رَب بن کر دِکھا

جلیل عالی اپنی نظم "پری ایمپشن" میں دہشت زدہ ماحول کی وجہ سے قیامت سے پہلے قیامت کا منظر دیکھتے ہیں۔ خُدائے پاک سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ خود خُدا نے قیامت کے دِن کے آنے کا اِشارہ دے کر اس کی نشانیاں بتائیں ہیں اور اپنی دہشت کے قائم ہونے کا اِقرار فرمایا ہے۔ شاعر کہتے ہیں قیامت تو جب آئے گی تو آئے گی مگر کیا کوئی اس کا جواب ہے کہ قیامت کے آنے سے قبل ہی بارود کے بڑھتے ہوئے استعمال نے قیامت کا منظر بپا کر دیا ہے۔ وہ سوال اُٹھاتے ہیں کہ اب ایسے حالات میں کوئی اس موجودہ قیامت سے ڈرے یا آنے والی حقیقی قیامت کی تیاری کرے۔

قیامت تیری جب آئے گی
پر بتا
زمین پر یہ انساں نما
غول در غول، بے دست و پا
میری براق رفتار کے سامنے رینگتا سلسلہ
میرے ہمزاد ڈرے ڈرے

میرے احکام مانے

کہ تیری اطاعت کرے

شفیق راؤ دہشت گردوں کو اللہ کی لاٹھی کا واسطہ دے کر کہ وہ بے آواز ہوتی ہے۔ اپنے انجام سے ڈراتے ہیں۔ اُن کی نظم کا عنوان ہی "اللہ" ہے۔ جس میں ان کی فریاد ملامتی رنگ اوڑھ لیتی ہے۔

مگر تم۔۔۔

جانتے ہی کب ہو کہ لاٹھی "رَب العالمین" کی

بے آواز ہوتی ہے

جانتے ہو اگر

تو یوں

زندگیاں اجیرن نہ کرتے اوروں کی

ج۔ قومی نظمیں

اُردو شاعری طویل اور مختصر قومی نظموں سے بھری پڑی ہے۔ شاعروں نے اپنے اپنے انداز سے اپنے ملک، قوم، پہاڑوں، وادیوں، دریاؤں اور جغرافیائی حدود سے محبت بھرے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ شاعر کے خیالات کا مواد گردو پیش کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ وہ خارجی تجربات اور حوادث کو داخلی تلخی کے ساتھ پیش کر کے تخلیقی مرحلے سے گزرتا ہے۔ حب الوطنی کا جذبہ انسانی سرشت کا جزو لاینفک ہے۔ ماضی میں جب بھی ملکِ پاکستان پر کوئی کڑا وقت آیا تو اِس ملک کے شاعروں نے اپنی قوم اور دفاعی اِداروں کے عزم و حوصلے کو بلند رکھنے کے لئے بے مثال نظمیں، گیت اور ترانے تخلیق کیے۔ جو نوجوانوں کا لہو گرماتے تھے اَور اُنہیں اپنے اپنے محاذ پر ڈٹے رہنے کے لئے تیار کرتے تھے۔ کی پاک بھارت جنگ ہو یا کا سانحہ، ملکی شعرا نے دونوں صورتوں میں اپنی افواج کو بہترین انداز سے خراجِ تحسین پیش کیا اور اُن کے جذبہِ شہادت کو سراہتے ہوئے دشمن کو یہ پیغام دیا کہ اُس نے ایک ایسی قوم کو للکارا ہے جو شہادت کے جذبے سے سرشار ہے اِس لئے دشمن کے پاس دو ہی راستے ہیں یا تو وہ واصلِ جہنم ہو جائے یا اپنے

ناپاک اور مذموم عزائم کو ترک کر کے واپسی کی راہ لے۔ اِن جنگوں میں شاعروں نے قومی نظموں کی صورت میں اپنے وطن کی سالمیت، اُس کی بقاء اور خوشحالی کے لئے دُعائیں بھی مانگیں اَور ہر محاذ پر قوم کو تیار رہنے کے لئے بھی کہا اور ہر مشکل گھڑی میں جو ہتھیار استعمال کرنا ہے وہ اللہ کی نصرت، باہمی اِتحاد اور وطن سے محبت ہیں۔

اِس ضمن میں مجید امجد کی نظم "خطہ ءپاک" میں وہ اپنے جیالے سپاہیوں اور سپوتوں کی شان میں اشعار لکھتے ہیں۔ مجید امجد شہادت کے جذبے سے سرشار دِل کو ناقابلِ تسخیر کہتے ہیں کیونکہ وہ زِندگی کو اپنے وطنِ عزیز کے لئے وقف کر کے سرخرو ہو جاتے ہیں۔

اِسی طرح احمد ندیم قاسمی کی نظم "کارواں بہاروں کا" وطن اور مٹی سے محبت کی عمدہ مثال ہے۔ احمد ندیم قاسمی کی شاعری میں جذبہ ءحب الوطنی کے مرکزی خیال کو سموئے ہوئے کئی ایک قومی نظمیں ملتی ہیں۔

اِسی عبید اللہ علیم اپنی نظم " اَے ارضِ وطن" میں اپنی محبت کے نذرانے ، وطن کی خدمت میں شاعرانہ رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ غزل کے شاعر ہیں لیکن جب وطن کی محبت کی بات آتی ہے تو اُن کا فن نظم میں بھی قلم چلانے لگتا ہے۔ اِس نظم میں شاعر نے اپنے ملک سے محبت اور وفا کا عہد نبھانے پر زور دیا ہے اور بتایا ہے کہ جب بھی ملک کو ہماری ضرورت پڑے گی تو ہم اس کی ہر آواز پر لبیک کرتے ہوئے جغرافیائی سرحدوں اور نظریاتی سرحدوں پر اس کے دفاع کے لئے بر سرِ پیکار رہیں گے۔

احمد فراز اپنی سرزمین کو سرسبز و شاداب دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے ملک کو دیگر اقوام کی فہرست میں سربلند دیکھنا چاہتے ہیں۔ اُن کی نظم "اَے وطن، اَے وطن" اس موضوع کی ایک خوبصورت نظم ہے۔

قومی نظموں کی یہ مختصر تاریخ بیان کرتی ہے کہ گذشتہ دو دہائیوں میں جب دُنیا بالعموم اور پاکستان بالخصوص دہشت گردی کی زَد میں آیا تو یہاں کے شاعروں، ادیبوں، مفکروں نے اِس کے خلاف اس طرح اور کیسا عمل دِکھایا۔ ایسے میں نظم کے شاعروں نے موضوع کے اعتبار سے اور پھر حالت و واقعات کے پیشِ نظر کیسی نظمیں تخلیق کی۔ نظم کے شاعروں نے کس طرح دہشت گردی کا شکار ہونے والے دفاعی اِداروں کے اہل کاروں کی ہمت اور حوصلے کی داد دی اور ساتھ ہی ساتھ عوام کے عزم و استقلال کو سراہتے ہوئے اس بات کی سعی کی کہ ہم جلد اِس ناسُور سے چھُٹکارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہونگے۔ شعرا حضرات نے اپنی نظموں میں ملک و قوم کے لئے نیک خواہشات کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ مملکتِ خُداداد کے ماضی کی شاندار مثالیں بھی دیں اَور اِس نظریے کو بھی اُجاگر کیا جو اِس مُلک کی آزادی کی وجہ بنا ہے۔ اِن شاعروں کی تخلیقات

سے ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کس طرح نظم کے موضوعات میں دہشت گردی، وحشت اور ڈر، خوف اور شدت پسندی سے تبدیلی آئی ہے اَور ایسے ماحول میں شاعر کیونکر محسوس کرتا ہے کہ یہ وقت ایسا ہے جس میں سب کو اِتحاد کی کوششیں کرنی چاہیں اور مل جل کر اپنے معاشرے سے شِدت پسندی اور دہشت گردی کو ختم کرنا چاہیے۔ اِن تمام نظموں میں ایک بات مشترک دِکھائی دیتی ہے کہ شاعر جذبہء حب الوطنی سے سرشار ہو کر اِس جنگ میں شہید ہونے والوں کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے اُن کی دلیری کی گواہی دے کر اِس عظم کا اِرادہ کرتا ہے کہ جس طرح شہیدوں کے لہو سے ملکِ پاکستان کی ماضی کی تاریخ رنگین ہے اِسی طرح شہیدوں کے خون سے "ضربِ عضب" ہو یا "ردالفساد" جیت اَمن کی ہی ہو گی اَور اِس پیارے وطن میں ایک دفعہ پھر سے اِس کی بہاریں رنگینیاں بھریں گی۔

نمائندہ قومی نظموں میں جو دہشت گردی کے تناظر میں تحریر کی گئیں اُن میں امجد اسلام امجد کی "چودہ اگست"، "اب فرض ہمارا ہے"، "آؤ وعدہ کریں" ڈاکٹر نثار ترابی نظم "اپنے مان اپنے پاکستان کے نام" مطبوعہ "ھلال"، شمارہ نمبر 3، مارچ۔ فراست رضوی کی "نغمہ وطن-میں ہوں پاکستان" مطبوعہ ماہنامہ "آہنگ" اگست، خالد احمد کی نظم "یہ کس نے آبِ رواں چادروں میں باندھ لیا" مطبوعہ ماہنامہ "بیاض" مئی، شامل ہیں۔

ملی ترانے / گیت

ملی ترانے نظم کی ہی ایک قسم ہے جس کو موسیقی کی لَے پر گایا جاتا ہے۔ پسِ منظری مطالعہ کو مدِ نظر رکھا جائے تو اِس حوالے سے ہمیں اور کی جنگوں کے حوالے سے کئی ایک ملی ترانے ملتے ہیں جن میں ملک و قوم کے دفاع کے لئے بر سرِ پیکار دفاعی قوتوں کی تعریف و تحسین کی جاتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے ملک کی خوبصورتیوں اور خوبیوں کو بھی گنوایا جاتا ہے۔

ملی ترانے اور گیت بدلتے ہوئے حالات اور واقعات کے مطابق اپنے بنیادی موضوعات تبدیل کرتے ہوئے موجودہ دور میں کئی مفاہیم کی طرف اِشارہ کرتے ہیں۔ خاص طور پر ملک کو درپیش دہشت گردی اور انتہا پسندی کی موجودہ پیچیدہ صورتِ حال میں شعرا حضرات نے جو ملی ترانے اور گیت لکھے ہیں اُن میں عوام کی قربانیوں اور دفاعی اِداروں کے عزم و حوصلے کو سراہا گیا ہے اور اِن کے جذبے کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔

ستمبر کو منظرِ عام پر آنے والا ملی ترانہ "میرے وطن میری عقیدتیں" آئی ایس پی آر کی طرف سے پیش کیا جانے والا ملی ترانہ ہے جسے سانول عیسیٰ خیلوی نے گایا ہے۔ اس گیت میں

ڈرامائی کردار حماد علی نے ادا کیا۔ یہ ترانہ دہشت گردی کے خلاف ملی ترانوں میں بہت مشہور ہوا ہے۔ اس میں وطن سے محبت، عقیدت اور اِرادت کے بیان کے ساتھ شاعر نے دہشت گردی کے خلاف لڑائی میں اپنے عظم کو دہرایا ہے۔

میرے وطن میرے بس میں ہو تو
تیری حفاظت کروں میں ایسے
خزاں سے تجھ کو بچا کے رکھوں
بہار تجھ پہ نثار کر دُوں

میرے وطن! میرے وطن
تیری محبت میں موت آئے
تو اس سے بڑھ کر نہیں ہے خواہش
یہ ایک جاں کیا ہزار ہوں تو
ہزار تُجھ پر نثار کر دوں

میرے وطن! میرے وطن

"بابا میری آواز سُنو ناں" اُن بچوں کی طرف حسرت بھری پُکار ہے جن کے سپاہی والد دہشت گردی کے خلاف جنگ میں کام آ چکے ہیں اور پیچھے رہ جانے والے بچے اپنے باپ کی کمی کو محسوس کرتے ہیں اور انہیں وارفتگی سے پکارتے ہیں۔ یہ نغمہ جون کو منظر عام پر آیا۔

بابا میری آواز سنو ناں
آواز سنو ناں
کہاں گئے آپ آ بھی جاؤ
بٹھا کے تم دِل پہ پھر گھماؤ

بابا میرے راز سُنو ناں
بابا میری آواز سُنو ناں

شفقت امانت علی خاں کا گایا ہوا ملی ترانہ "محافظ" پاک فوج کے لئے اخراج عقیدت ہے جو اپنی جانیں خطروں میں ڈال کر دہشت گردی کے محاذ کے خلاف ڈٹے ہوئے ہیں۔ یہ گیت دسمبر کو منظرِ عام پر آیا۔

محافظ امن کے ہم ہیں یہ دُنیا کو دِکھایا ہے
ہمارے پھول سے بچے شجاع کے نشاں
ستم گر کے لئے جو موت جری جواں ٹھہرے
انہی کی جراتوں نے قوم کو یکجا بنایا ہے
محافظ امن کے ہم ہیں یہ دُنیا کو دِکھایا ہے

ننھے گلوکار غلام مرتضیٰ کا گایا ہوا ملی ترانہ "بابا میرے پیارے بابا" بھی ایک شہید مجاہد کے بیٹے کے جذبات کا آئینہ دار ہے جس میں بیٹا اپنے شہید باپ کی کمی کو محسوس کر کے اپنی محبت کا اظہار کر کے کرتا ہے اور اپنے باپ کی شہادت پر فخر کرتا ہے اور اُس کو پوری دُنیا کے لئے امن کا نشان قرار دیتا ہے۔

یہ نہ سمجھنا ہار گیا ہوں
میں دُنیا سے بھاگ گیا ہوں
بیٹا ہوں میں تیرا بابا
آج نہیں ہے میرا بابا
تم کو فخر ہے مجھ پہ بابا
تمام جہاں تو ہے تجھ پہ بابا
سہہ لینا یہ جُدائی بابا
جو قسمت میں آئی بابا
خوابوں میں اب خاک رہے گی
یاد میری تیرے ساتھ رہے گی

بابا میرے پیارے بابا
مجھ کو بھی تم یاد آتے ہو

خرم اقبال اور نتاشا بیگ کا ملی ترانہ "بھولنا نہیں" جو صباحت علی خان نے لکھا ہے۔ اس ترانے میں بھی اُداس لہجے میں اُس شہید بچے کا قصہ ہے جو اس بات کی فریاد کر رہا ہے کہ مجھے بھولنا نہیں۔

بھولنا نہیں بھولنا نہیں
میری ہنسی کو یادوں کی دل لگی کو
جھوم کے کھکھلائے تھے جس دل پر

اُس خوشی کو

بھولنا نہیں بھولنا نہیں

میجر عمران رضا کا لکھا ہوا ملی ترانہ جسے ننھے گلوکار اذان علی نے آواز کا رُوپ دیا ہے ایسا ملی گیت ہے جو زیر تعلیم طلبا کے دل کی آواز اور اُمنگوں کا ترجمان ہے۔

قلم کی جو جگہ تھی وہ وہی ہے

اور اُس کا نام تک باقی نہیں ہے

قلم کی نوک پہ نقطہ ہے کوئی جو سچ ہے بھلا رُکتا ہے کوئی

وہ جس بچپن نے تھوڑا اور جینا تھا

وہ جس نے ماں تمہارا خواب چھینا تھا

مجھے ماں اُس سے بدلہ لینے جانا ہے

مجھے دُشمن کے بچوں کو پڑھانا ہے

میجر عمران رضا کا لکھا ہوا ایک اور ملی ترانہ جو آئی ایس پی آر کی پیشکش ہے بہت زیادہ مقبولِ عام ہوا ہے جس میں آواز کا جادُو ننھے اذان علی نے جگایا ہے۔ یہ ملی ترانہ میں ریلیز ہوا۔ اس گیت میں جذباتی انداز میں اُس بچے کی داستان کو رقم کیا گیا ہے جو گھر سے تعلیم کے لئے نکلا مگر واپس نہ لوٹا۔ اس ملی نغمے میں دہشت گردوں کے لئے واضح پیغام موجود ہے کہ وہ اپنی تخریبی کارروائیوں سے قوم کے بچوں تک کو توڈرا نہ سکے وطن کے باقی سپوتوں کا کیا بگاڑ لیں گے۔ اِسی بنا پر دشمن کو ایک بزدل دشمن ہونے کا طعنہ دیا گیا ہے۔

پتہ کیا پوچھتا ہے تو کتابوں میں ملوں گا میں

کیے ماں سے ہیں جو میں نے کہ وعدوں میں ملوں گا میں

میں آنے والا کل ہوں وہ مجھے کیوں آج مارے گا

یہ اس کا وہم ہو گا کہ وہ ایسے خواب مارے گا

تمہارا خون ہوں نا اِس لئے اچھا لڑا ہوں میں

بتا آیا ہوں دشمن کو کہ اُس سے تو بڑا ہوں میں

میں ایسی قوم سے ہوں جس کے وہ بچوں سے ڈرتا ہے

بڑا دشمن بنا پھرتا ہے جو بچوں سے ڈرتا ہے

پی ٹی وی کا ملی ترانہ جو مشہور گلوکار فاخر نے گایا ہے۔ اور شاعر ایس کے خلش نے تحریر کیا ہے ایک ایسا ملی نغمہ ہے جو سچے جذبوں کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ مظلومیت کا شار ہونے والوں کے غم کا عکاس بھی اور عزم و حوصلے کی بنیاد بھی۔ اس ترانے کا عنوان "دُنیا کو بتادیں گے ہم" ہے۔

وہ صبح ہمیشہ کی طرح　　اُس دِن بھی آئی تھی
آنکھیں مل کے جاگی تھی زِندگی　　اور مسکرائی تھی
ہنستی بستی تھی آنگن میں ہر پل جو زندگی
چن کے رکھتا تھا آنکھوں میں یہ دل جو ہر خوشی
منزلوں کو جانے تھے جو راستے
گم ہوئے نا جانے کہاں وہ راستے

میجر عمران رضا کا تحریر کردہ "ہر اک پاکستانی نے پکارا پاکستان" جسے شفقت امانت خان نے گیت سنگیت کا رُوپ دیا۔ آئی ایس پی آر کی پیشکش ہے۔ یہ ملی نغمہ آج کے ہر پاکستانی کے دل کی آواز ہے۔ اس نغمے کے اندر دشمن کو للکارا گیا ہے اور اُسے اِس حقیقت کا ادراک کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ پاکستان ایک امن کا رکھوالا اور امن پسند ملک ہے۔ اس کی طرف میلی آنکھ سے دیکھنے والا دشمن اپنی موت آپ مر جائے گا۔

دل کا جنوں جو رگوں سے بہا ہے
دل آزمایا تو ڈر نہ لگا ہے
نہیں خوف کوئی بھی دشمن کا ہم کو
نہیں ملنے دیں گے یوں دھرتی سے غم کو
نہیں ملنے دیں گے یوں دھرتی سے غم کو
ہر اک پاکستانی نے پکارا پاکستان
امن کا نشان یہ ہمارا پاکستان

د: شہر آشوب

"شہر آشوب" نظم کی وہ صورت ہے جس میں تباہ شدہ شہروں کی حالتِ زار کا نقشہ کھینچا جاتا ہے۔
ڈاکٹر سلیم اختر اپنی توضیحی لغت "تنقیدی اصطلاحات" میں شہر آشوب کی وضاحت میں لکھتے ہیں:
شہر آشوب ایسی نظم ہے جس میں کسی ملک / خطہ / حکومت کی تباہی

کے حوالے سے وہاں کی تہذیب و تمدن اور مجلسی زِندگی کے اَبتر
ہونے اور اہلِ علم، اہلِ خرد، اہلِ قلم، اہلِ حرفہ، اہلِ ہنر کے برباد
ہونے کا ماتم کیا گیا ہو۔ 🗁

دہشت گردی سے تباہ حال شہروں کی تباہی اور بربریت کا حال اُردو نظم کے شعرا کے ہاں بھی ملتا ہے۔ اگرچہ یہ صنف (شہر آشوب) وقت کے ساتھ ساتھ معدوم ہو رہی ہے اور اس صنف پہ قدما کی طرح آج شعرا خاطر خواہ انصاف نہیں برت رہے تاہم دہشت گردی سے متاثرہ ماحول میں اجڑنے والے شہروں اور قصبوں کے غم کے ملنے کے بعد شعرا ابھی کسی نہ کسی حوالے اور کسی نہ کسی زاویے سے آشوب لکھنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اگرچہ اب بھی ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ اور روایتی طریقہء تحریر سے ہٹ کر وہ آزاد نظموں یا نثری نظموں کے اسلوب میں اس صنف کو لکھ رہیں ہیں تاہم اس کم مائیگی میں یہ بھی غنیمت ہے۔

شعرا نے عام طور پر ایسے شہروں کی بپتا کو بیان کیا جو دہشت گردی سے زیادہ اور بہت زیادہ متاثر ہوئے، ان شہروں باجوڑ، کوئٹہ، پاراچنار، کراچی، لاہور، پشاور اور دیگر شامل ہیں۔ خودکش، یرغمالی منصوبہ بندیوں، قتل و غارت، مسجدوں امام بارگاہوں، بازاروں میں دھماکوں اور اس طرح کی صورت حال کو انہوں نے کماحقہ، اپنی شاعری میں سمیٹا ہے۔ اور واقعتاً شہروں درست تصویر کشی کر کے آشوبِ شہر کا منظر بیان کیا ہے۔

کشور ناہید اسی سلسلے میں باجوڑ کا تعزیت نامہ تحریر کرتی ہیں۔ اس ضمن میں میں جو بے بسی کی کیفیات ان پہ طاری ہوتی ہیں ان کی بدولت وہ نفسیاتی طور پر آسمان سے مدد کی خواہاں ہیں۔ لیکن جب آسمانی مدد بھی نہیں پہنچ پاتی تو کشور ناہید کا ترقی پسند توانا لہجہ انسانیت کے بیدار ہونے کے یقین سے گویا ہوتا ہے۔ لیکن ان کی یہ امید گولیوں کی تڑتڑاہٹ میں دم توڑ جاتی ہے جب کھیتوں کو پانی کی بجائے باجوڑ کے معصوم بچوں کے خون سے سیراب کیا جاتا ہے تو دوسری طرف شاعرہ کی آنکھوں سے نکلنے والا پانی ان کے تکیے کو سیراب کرتا ہے:

وہی آنگن وہی ہے چھاج لیکن
گولیاں ان میں اچھلتی، چھیدتی ہیں
میرے کھیتوں، میرے بچوں کو

میں اپنے بھیگے تکیے کو لئے

آنگن میں بیٹھی ہوں
جنازے اس قدر ہیں
شہر چھوٹے ہوتے جارہے ہیں۔ 📄📄

کوئٹہ وطنِ عزیز کے اُن شہروں میں شمار ہوتا ہے جہاں کے لوگ دو طرح کی دہشت گردی یعنی اندرونی اور بیرونی دہشت گردی کا شکار ہیں۔ اس شہر کی مشکلات، تباہ کاریاں اور بم دھماکوں کے بعد کی صورتِ حال کو بھی اُردو نظم کے شعرا نے اپنے خیالات اور احساسات کا موضوع بنایا ہے۔

شہزاد نیرؔ جو خود بھی پاک برّی فوج کا حصّہ ہیں اور ان کی شاعری ہمارے لئے اثاثہ ہے۔ کوئٹہ، پارا چنار اور کراچی جیسے شہروں پر ہونے والے سانحات کا جو عین مقدس تہوار عید کے قریب قریب وقوع پذیر ہوئے مشترکہ نوحہ لکھتے ہیں اور غمزدہ لہجے میں اجڑے دیاروں کو بچشمِ نم، بہ اندازِ بے دلی عید مبارک کہتے ہیں:

اے اڑتی ہوئی خاک چمن، عید مبارک
اے سہمی ہوئی ارضِ وطن عید مبارک
مقتول اجالوں کا لہو دیکھنے والوں
لو چاند سے کہتا ہے گہن، عید مبارک
ہر روز نیا ظلم، نیا خون زمیں پر
اب ہوتی نہیں چرخ کہن، عید مبارک
سڑکوں پہ لگی آگ میں جلتے ہوئے انساں
میں سوختہ دل، سوختہ تن، عید مبارک 📄📄

شہزاد نئیر "وزیرستان" کے اجاڑ کا مرثیہ بھی لکھتے ہیں اور اس شہر کی ہونے والے پے در پے دھماکوں کے بعد کی صورت حال سے قاری کو آگاہ کرتے ہیں۔ وہ میمنہ و میسرہ کی روایتی جنگی ترتیب کے بغیر ہی حملہ آوروں کی طرف سے شروع کی گئی جنگ پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں کیونکہ خودکش بمبار تو دراصل چھپ کر وار کرتا ہے۔

دہشت گردی کی اس جنگ کا منظر کھینچتے وقت اور اس بات پر کفِ ماتم بچھاتے ہیں کہ مارنے والے اور مرنے والے ایک ہی قادر مطلق کے مقلّد ہیں لیکن پھر بھی ہر طرف لاشیں ہی لاشیں، دھول ہی دھول، غبار ہی غبار ہے۔ کیا ایسی بربریت کا مظاہرہ کرنے والے سوچتے نہیں، کیا خُدا نے ان کی عقل نہیں دی:

میری پکاروں میں، تیرے نعروں میں اسم اک ہے
یہ میں گراہوں کہ تُو گرا ہے
کسی پہ کھلتا نہیں کدھر ہے
فلک کہاں ہے، زمیں کدھر ہے
یہ بھاگتے اسپ
شر سواروں کے تند نعروں سے کس قدر دھول اُٹھ رہی ہے
غبار آلود منظروں میں تمام سمتیں بدل گئی ہیں
الٹ پلٹ ہو کے میں کدھر ہوں
کہیں غلط ہو کے تو کدھر ہے
وہ وعدہء ناوفا کدھر ہے
خُدا کدھر ہے!

سدرہ سحر عمران اپنے آشوب، "شہر ادھیڑا جا چکا ہے" میں اپنے ملک کے شہروں کے اجڑنے اور قتل وغارت، میزائل حملوں، خود کش بمباروں کے ہاتھ سڑکوں، مکانوں، اور گلی محلوں کی تباہی کی نوحہ گری کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ وہ استعاراً کہتی ہیں:

تم ہمیں پرچموں سے مکان بنا کر دیتے
اور کہتے ہیں کہ سمندروں کے حق میں دستبردار ہو جاؤ
تب ہم اپنی آنکھیں کھود کر
ایک اڈھرا ہوا شہر دریافت کرتے تھے۔
تم نے زمیں کی چُپ سنی
اگر نہیں۔۔۔ تو مجھے خود سے علیحدہ کر کے دیکھنا
تو تمہیں مجھ میں شناخت کر پاتا ہے
کوئی بتا سکتا ہے کہ کتنی قبروں کا
ایک دوسرے میں آنا جانا ہے۔

فاخرہ بتول بھی اپنی نظم میں کوئٹہ کے لئے غم زدہ ہیں جو کسی نہ کسی طور پر اندرونی اور بیرونی سازشوں کا شکار شہر ہے اور آئے دن وہاں بھی قتل وغارت کا بازار گرم رہتا ہے۔ نظم "کب تک" میں وہ ظلم کی بڑھتی

ہی جاتی مہر میں خود کو بے بس تصور کرتی ہیں۔ وہ امن کی خواہاں ہیں لیکن انہیں امن ملتا دکھائی نہیں دے رہا۔ وہ انتہائی مایوسی کے عالم میں کہتی ہیں:

بے گناہ جانوں کا، خون بہے گا کب تک
کب تلک عدل کی زنجیر کو کاٹے گا یہ زنگ
کب تلک حق کو مٹائے گا یہ باطن کا جنوں
کب تلک، کب تلک یہ ظلم کا چھائے گا غبار
امن کی آئے گی اس صحن میں کب پھر سے بہار؟ ⏳📃

سیما غزل کی نظموں میں بھی کوئٹہ شہر کا آشوبی دُکھ نمایاں طور پر ملتا ہے۔ وہ یکے بعد دیگرے ہونے والے بم دھماکوں میں اجڑنے والے خاندانوں سے اظہار ہمدردی کرتی ہیں اور بم دھماکے کے بعد کی تباہ کاریوں کو خوبصورت لفظوں اور جذباتی رنگوں کے ساتھ واقعاتی رنگ فراہم کرتی ہیں۔ وہ اس بات پر ماتم کناں ہیں کہ ہر روز کئی کئی جنازے اُٹھانے پڑتے ہیں۔ اپنے آشوب "نئے سانحے کا جنازہ پڑھیں" میں لکھتی ہیں:

کوئٹہ کی سڑک جس پہ لوگوں کا اتنا لہو بہہ گیا
اس کو دھویا گیا
اب وہاں پر کوئی بھی نشاں تک نہیں
جلنے والوں کا اب تو دھواں بھی نہیں
ہاں مگر رات بھر۔۔۔ اور برسوں تلک
سسکیاں جو فضاؤں میں گونجا کریں گی وہاں
مائیں بہنیں سبھی بیٹیاں
سارے بچے بھی ڈھونڈا کریں گے اُنہیں
جن کو قربان ہونا نہیں تھا مگر
وہ بھی قربان ہوئے
تعزیت اور مذمت کی رسمیں تو ہو ہی گئیں
لوگ واپس ہوئے
اب چلو دوسرے حادثوں کی طرح
اس نئے سانحے کا جنازہ پڑھیں ⌨📃

اوصاف شیخ انتہائی جذباتی انداز میں شہروں کی تباہ کاری کا حال ایک نئے انداز میں بیان کرتے ہیں۔ وہ اپنی نظم "بوسینا" میں دہشت گردی کی جڑیں تلاش کرتے ہیں اور نکتہ اُٹھاتے ہیں کہ اس دہشتی واقعات نے ننھے بچوں کو بھی اجاڑ کر رکھ دیا ہے۔ بچوں کے دل و دماغ پر اب گڑیائیں نہیں اور پریوں کے خیالات نہیں آتے۔ اب تو وہ دھماکوں سے ہونے والی جانوں کے ضیاع اور گولیوں کی تڑتڑاہٹ میں بہتے خون کی کہانیوں کی عادی ہو چکے ہیں۔ انہیں ان دہشت زدہ بچوں کی بھوک اپنے پیٹ میں محسوس ہوتی ہے۔

پانچ سال کی میری بیٹی
مجھ سے کہتی ہے
یہ بچوں کو کون مارتا ہے؟
انہیں کھانا کیوں نہیں ملتا۔
اس بچی کی گڑیا کو کیا ہوا ہے
تم انہیں کوئی کہانی سناؤ نا بابا۔۔۔!

حمزہ ہاشمی سوزؔ ماہنامہ "بیاض" لاہور میں چھپنے والی نظم "شہر آشوب" میں سانحہ پشاور کے حوالے سے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں اور بیان کرتے ہیں کہ شہر کے اجڑنے پر حکام بالا کی خاموشی پر بھی شاعر خاموش نہیں رہ سکتا اور احساس کو جگانے کا فریضہ سر انجام دیتا ہے۔

مرے نوحہ گر میرے راہبر
جنہیں فکرِ نان و غنا نہیں
جنہیں عیشِ فرطِ دوام ہے
جنہیں "پاسِ حرف" رہا نہیں۔

میرے اہل دل، مرے دزدِ شب
بڑے مکر و فن میں کمال ہیں
یہی گرگسوں کے لباس میں
میرے دشمنوں کا ہی جال ہیں۔

اعجاز احمد صوبہ کے پی کے سے تعلق رکھتے ہیں اور پختہ کار شاعر اور تدریس کے شعبے سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے پشاور شہر کا آشوب بہت موثر اور دل پذیر انداز میں تحریر کیا ہے۔ وہ پشاور کے اجڑ جانے پر ماضی کے شہر کو یاد کرتے ہیں۔ جہاں رونقیں، چہل پہل، بیٹھکیں اور خوشیاں ہوا کرتی تھیں۔

اب تک ہے نگاہوں میں ترا حسنِ طرحدار
اے شہر پشاور، تری گلیاں ترے بازار
ہیں آج بھی یادوں میں ترے بام، ترے در
اے شہر دل آرام ترے سرو و صنوبر
ماضی کے جھروکوں سے جو دیکھوں تو ترا رنگ
جو دستِ گل اندام میں گل دستہء خوش رنگ

وہ مزید لکھتے ہیں کہ بدلتے ہوئے حالات میں جب ہر طرف وحشتی کاروبار گرم ہے اور خوف کا سایہ ذہنوں میں مسلط ہے تو وہ رونقیں، خوشیاں، بیٹھکیں اور میل جول محض گھروں کے اندر ہی قید ہو کر رہ گیا ہے۔ اب یہ شہر شب ظلمات اور شہر خموشاں کی مثال بن گیا ہے۔

اک عمر سے دیکھا نہیں ہے تیرا تبسم
گلیاں تیری خاموش تو بازار ہیں گم صم
ہر روز نیا زخم، نیا درد، نیا روگ
بوڑھوں کا کبھی سوگ تو بچوں کا کبھی سوگ
اے شہر وفا، شہر حسیں، شہر نگاراں
اے شہر فنا، شہر حزیں، شہر فگاراں

یہ آشوب اجڑے ہوئے شہر کی خوبصورت منظر کشی ہے۔

ھ: قطعات

دہشت گردی کے موضوع کو سامنے رکھتے ہوئے اُردو نظم کے شعراء نے اُردو قطعات کی طرف بھی خاصی خصوصی توجہ دی ہے اَور اس مقبولِ عام صنف کو زِندہ رکھنے میں اپنا حصہ ڈالا ہے۔ شعرا نے اپنے قطعات میں اُس مجموعی فضا کی بھرپور عکاسی کی ہے جس کا سامنا اِس وقت پاکستان کی ریاست اور عوام کو ہے۔ چار مصرعی مختصر نظم میں جن بڑے بڑے اور توانا موضوعات اور مضامین کو شعرا نے قلم بند کیا ہے یہ اُن کی

حساسیت اور حب الوطنی کی دلیل ہے۔ قطعات کے اَندر شعرا نے حتیٰ الامکان اپنے موضوع کو انتہائی مقصدیت سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہیں وہ بم دھماکوں سے پیدا ہونے والے اثرات کو بیان کرتے ہیں تو کہیں کشت وخون کی اِس ہولی کے کھیلنے پر شِدت پسندوں کو لفظی لعنت کا حقیقی مستحق قرار دیتے ہیں۔ شعرا حضرات اپنے قطعات میں وطن کی محبت کے پرچار کے علاوہ اِتحاد اور یگانگت کو فروغ دینے کے لئے مستعد دِکھائی دیتے ہیں۔ قطعات میں اُن کے پیشِ نظر محض عوام کی فلاح اور امن کی خواہش ہے جس کو عوام نے بھی بڑی شدت کے ساتھ طلب کیا ہے اور شعرا کا مطمع نظر بھی ہے۔

جنید آزر اپنے ایک قطعہ میں برسرِ اقتدار قوتوں کے منفی خیالات کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اپنے اِقتدار کو طول دینے کی خاطر یہ لوگ ہر طرح کی مصالحتی کوششوں میں لگے رہتے ہیں جس کا بنیادی مقصد صرف یہ ہے کہ وہ اپنی حکمرانی کی عمر بڑھاتے جائیں۔ ملکِ عزیز میں بسنے والے لوگوں کی عمریں بے شک دہشت اور وحشت کے ماحول میں کم ہوتی جائیں۔

حشمتِ تخت گنوانا بھی نہیں چاہتے ہم
اور تلوار اُٹھانا بھی نہیں چاہتے ہم
چاہتے ہیں کہ سلامت رہے سرداری بھی
شہر میں خون بہانا بھی نہیں چاہتے ہم

سیما غزل اپنے ایک قطعے میں ملکی مجموعی حالات کا ایک سرسری جائزہ پیش کرتی ہیں کہ بظاہر تو ہم سب اپنے اپنے کام دھندے میں مصروف اور مست نظر آتے ہیں لیکن مجموعی فضا سوگوار ہے اور اِس سوگواریت کی اصل وجہ وہ دہشت گردی ہے جس کا نشانہ بن کر آئے دِن کئی جانیں لقمہء اَجل بن جاتی ہیں۔ اِسی لئے شاعرہ یہ بات کہنے پر مجبور ہے کہ گھر کے کونے میں سوگ رکھا ہے۔ ناجانے کب ملک عزیز کے کسی کونے سے کوئی بُری خبر آجائے، کوئی حادثہ اور کوئی سانحہ آنکھوں کو نم دیدہ کر جائے:

دِل میں کچھ اَور تو نہیں لیکن
اِک محبت کا روگ رکھا ہے
گنگناتی ہوئی فضا ہے مگر
گھر کے کونے میں سوگ رکھا ہے

رائے شوکت علی وراہ کا لکھا قطعہ ایک مزاحمتی، ایک ردِ عمل کا بیانیہ ہے جس میں شاعر یہ کہنے پر مجبور ہو رہا ہے کہ ظلم اور ستم جھیلتے، اذیت اور کرب کا سامنا کرنے کے بعد ہمیں صبر نے یہ سکھایا ہے کہ خود پہ تو جو بھی بیتی وہ ہم نے باامر مجبوری سہہ لی لیکن کیا ہم آنے والی نسلوں کے لئے بھی ایک ڈر، خوف، وحشت اور دہشت کی فضا چھوڑ کر جائیں گے۔ یقیناً ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ہم نے ہر قاتل کو اُس کے منطقی انجام کو پہنچانا ہے تاکہ ہماری آنے والی نسلیں معاشرے میں سُکھ کا سانس لے سکیں۔ ایسا اُس صورت میں ممکن ہے کہ جب ہم ہر قاتل، ہر ظالم، ہر دہشت پسند دہشت گرد کو تحفے میں گولی دیں یعنی اِن شدت پسندوں سے آہنی ہاتھ سے نپٹا جائے۔

سڑکوں پر سونے والوں کے دِل میں اِک حسرت ہے کب کی
اپنے ہر قاتل سے ہم بھی کچھ تو بدلہ لیتے جاتے
آنے والی پیاری نسلوں کی خاطر ہر قاتل کو
مرنے سے پہلے تحفے میں اِک گولی ہی دیتے جاتے

دہشت گردی کی موجودہ لہر نے ملکِ عزیز میں تقریباً ہر طبقہء فکر کے افراد کو ہی گہنا کہ رکھ دِیا ہے۔ خوشیاں خوشیاں نہیں لگتیں۔ تہوار پھیکے پھیکے اور رُوٹھے رُوٹھے ہیں۔ اِسی تناظر میں ناصر بشیر کا یہ قطعہ حالاتِ حاضرہ کی بہترین عکاسی کرتا ہے کہ عید کے پُر مُسرت موقع پر ہمیں ایک دوسرے کو عید مبارک کہنی چاہیے، خوشیاں بانٹنی چاہیں تاکہ حادثوں کی زَد میں بھی زِندہ رہنے کی اُمید اَور حوصلہ پنپتا رہے۔

اِس بار خوشی روٹھ گئی اہلِ وطن سے
"اِس حادثہء وقت کو کیا نام دیا جائے
ہے رسم زمانہ کہ کہیں عید مبارک
اِک دوسرے کو جینے کا پیغام دِیا جائے

وطنِ عزیز میں پھر سے اَمن ہو جائے، خوشیاں لوٹ آئیں، لوگوں کے چہروں سے خوف و ہراس اور دہشت کے سائے ہمیشہ کے لئے چھٹ جائیں۔ اِسی طرح کے خیالات کا اظہار عارف فرہاد نے اپنے ایک قطعہ میں کیا ہے۔ وہ یہ پیشکش کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ وطن میں اَمن اور روشنی کا دور پلٹ کر لانے کے لئے جان کی بازی سے بھی دریغ نہیں کرنا چاہیے۔

نہ سیم و زر، نہ سمن اَور نہ باغ مانگتا ہے

یہ دِل وطن کے عدُو کا سراغ مانگتا ہے
زمانہ مُجھ کو جلادے کہ روشنی ہو جائے
میرے وطن کا اندھیرا چراغ مانگتا ہے

کچھ قطعات خاص طور پر کسی مخصوص سانحہ، حادثے یا دھماکے کے تناظر میں بھی لکھے گئے ہیں۔ شہباز انور خان کا ایک قطعہ سبزی منڈی بم دھماکے کی یاد میں لکھا گیا جو روزنامہ ایکسپریس اسلام آباد بتاریخ جولائی، کا مطبوعہ ہے۔ اِس میں شاعر یہ بات کہنے پر مجبور ہے کہ دھماکے کی نذر ہونے والی جانیں کس قدر بے وقعت ہو کر رہ گئی ہیں۔ اِس قدر بے توقیر اور ارزانی اِنسانی جانوں کے ساتھ پہلے تو کبھی نہیں تھی۔ پاکستانی معاشرے کے افراد کو بارود کے دھوئیں نے بڑی بے دردی اور بے وقعتی سے اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے اور ساری فضا کو ماتم اور بین کی آہ وزاریوں میں الجھا دیا ہے۔

پھر دھماکہ ہو گیا ہے شہر میں
پھر فضا میں بڑھ گئی ہے تیرگی
زندگی ارزاں ہوئی ہے جس قدر
اس قدر پہلے کبھی ارزاں نہ تھی

سانحہ ء گلشن اقبال لاہور پر شاعر جمشید چشتی اپنے تحریر کردہ قطعہ مطبوعہ ماہنامہ "بیاض" لاہور، شمارہ مئی 2016 کے اَندر بم دھماکے کے بعد پیدا ہونے والی صورتحال پر آہیں اور سسکیاں بھرتے ہوئے دِکھائی دیتے ہیں۔ ہر طرف بکھری لاشوں پر وہ ہائے ہائے کرتے ہیں اور اپنے شہر کے گلستان اُجڑنے پر ماتم کناں ہیں۔

ہے زمیں لہو لہو، آسماں لہو لہو
مرے شہر کا ہوا، گلستاں لہو لہو
زخم زخم آہ آہ، لاش لاش ہائے ہائے
گرد گرد آگ آگ، دھواں دھواں لہو لہو

کوئٹہ کے حالات پر اعتبار ساجد کا قلم بھی خاموش نہیں رہ سکتا۔ وہ بھی شہر میں بہنے والے خون پر لب کشائی کی جسارت "سانحہ ء کوئٹہ" کے عنوان سے لکھے گئے قطعہ میں کرتے ہیں۔

خون دل جیسا ہے یہ رنگِ خبر کیسا ہے

صبح کے ہاتھ میں یہ کاسہء سر کیسا ہے
کون دشمن میرے گھر کے در و دیوار کے ہیں
شہر گل، آج بھی تُو خون میں تر کیسا ہے

شاعر جب اپنے اِرد گرد کے ماحول سے تنگ آجاتا ہے پھر وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ایسی بے یقینی کی صورت حال میں وہ اپنا ٹھکانہ کہاں بنائے۔ کیونکہ ماحول میں ڈر اور بے یقینی اِس قدر ہے کہ سارا منظر دھوئیں اور بارود کے پس منظر میں گم ہو گیا ہے۔ اسطرح کے حالات میں زمین پر زندگی بسر کرنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ یوسف حسن انتہائی باریک پیرائے میں شعر کہنے والے شاعر ہیں۔ اپنے ایک قطعہ میں وہ اس بات کے قائل دِکھائی دیتے ہیں کہ ہمیں جس صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے یہ ہماری اپنی ہی کمائی ہے کہ ہم غیروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے نہیں تھکتے اور اُن کی ہاں میں ہاں ملاتے چلے جاتے ہیں تاکہ وقتی منفعت حاصل کر سکیں۔ وہ اس بات کی نشاندہی کرتے ہوئے اس بات پر بضد ہیں کہ امن کا نعرہ لگانے والے بھی اَمن کو تار تار کر رہے ہیں۔ اُن کی اَمن پسندی صرف تشہیر کے لئے ہے۔ اِس کے پیشِ نظر کوئی سنجیدہ کوشش نہیں۔

اک ہاتھ کی مُٹھی میں تو سورج تھے مقیدّ
اک ہاتھ شعاعوں کی گدائی کے لئے تھا
بندوقیں اُٹھاتے ہوئے پھرتے تھے شکاری
اور شور پرندوں کی رہائی کے لئے تھا

شاعر خواہشوں، آرزوؤں اور اچھے دِنوں کا متلاشی ہوتا ہے۔ وہ اُمید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ اِسی بنا پر وہ رجائیت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگرچہ شہر میں کچھ بھی سلامت نہیں رہا اور سب کچھ آگ کی نذر ہو گیا ہے لیکن پھر بھی محبت اور اَخوت کے پھول کھلائے جا سکتے ہیں۔ شاعر معاشرے کا ترجمان ہوتا ہے۔ اس کا غم کائناتی اور آفاقی ہوتا ہے۔ اس تناظر میں انور شعور پاکستان اور بھارت کی دو تہذیبوں پر گہری تنقید کرتے ہوئے بھارت کے مسلمانوں کی حالتِ زار اور محرومیوں کو بیان کرتے ہیں کہ وہاں کی ریاستی دہشت گردی اور ہندوؤں کے ہاتھوں قتل و غارت نے سرحد پار کے مسلمانوں کا عرصہء حیات تنگ کر رکھا ہے۔ حتیٰ کہ اُن کو مذہبی رسومات کی بھی ادائیگی کی بھی اجازت نہیں۔ اِسی بات کو طنزاً اپنے قطعہ میں بیان کرتے ہیں کہ گاؤ ماتا کو کیوں ذبح کیا جائے جب کہ ہمارے پاس ذبح کرنے کے لئے مسلمان بہت ہیں۔

کیوں بھلا ظلم کرے جانوروں پر کوئی
مارنے کے لئے انسان بہت سارے ہیں
گاؤماتا کے ذبیحے کی ضرورت کیا ہے
ذبح کرنے کو مسلمان بہت سارے ہیں 🗁

آرمی پبلک سکول پشاور میں دہشت گردی کے واقعے نے شاعروں کے حساس ذہنوں پر بڑے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ اپنے ایک قطعہ میں نوجوان شاعر تنویر پھول آرمی پبلک سکول کے حادثے کو کربلا کے واقعہ سے جوڑتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جس طرح کربلا کے میدان میں ننھے علی اصغر کا خون بہا تھا بالکل اِسی طرح آرمی پبلک سکول پشاور میں بہت سارے ننھے طالب علموں کو علم کی پیاس بجھانے کی کوشش میں اُنہیں خون میں نہلا دیا گیا۔

یاد آتے ہیں اکبر و قاسم
ظالمو! غم ہے دیدۂ تر میں
خون بھی بہہ گیا ہے اصغر کا
منظرِ کربلا پشاور میں 🗎

اِسی سانحہ کے تناظر میں اپنے ایک اَور قطعہ میں نوجوان شاعر تنویر پھول کہتے ہیں کہ حالیہ دہشت گردی کی لہر میں کسی اِدارے کو بھی محفوظ نہیں چھوڑا۔ حتیٰ کہ علم کی پیاس بجھانے کے لئے آنے والے بچوں کی شہ رگوں کو بھی کاٹ کر اِن کے خون سے ہولی کھیلی گئی۔ ایسا کرنے والے اپنے سینے میں دِل نہیں بلکہ ظلم و جبر کا پتھر اپنے سینے میں رکھتے ہیں۔ یہ وحشی درندے آج بھی اپنے قبیلے کی نمائندگی کرتے ہوئے معاشرے کا امن و استحکام گولی، بارود اور آگ کی نذر کر دیتے ہیں۔

پھول شبنم کے ہوئے آنسو رواں
غنچہ و گل ہو گئے کتنے شہید
ظلم یہ کیا پشاور میں ہوا
آگے قابیل و چنگیز و یزید 🗏

انور مسعود قطعات کی دُنیا میں ایک معروف اور پہچانا نام ہے۔ اگرچہ اُن کی وجہ شہرت مزاحیہ قطعات ہیں لیکن سنجیدہ پیرائے میں جب بھی اُنہوں نے قلم اُٹھایا ہے دِل کے پھپھولوں کو سامنے لا کے رکھ دِیا

ہے۔اپنے الگ اور منفرد انداز میں دہشت گردی کو ہر شکل میں ناقابل برداشت قرار دیتے ہیں۔دہشت گردی کے منفی اثرات کو اپنے قطعات میں شعری رنگ میں بیان کرتے ہیں۔وہ عسکری اور دفاعی قوتوں کے کردار کو بھی سراہتے ہیں اور دہشت گردی کو ختم کرنے کے لئے اُن کی کاوشوں کی حمایت کرتے ہیں۔وہ اپنے ایک قطعہ میں اس بات پر پُر اُمید ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور موجودہ عسکری قیادت کی مدد سے پاکستانی قوم کو بہت جلد دہشت گردی کی اِس لعنت سے چھٹکارہ مل جائے گا۔

دیکھ لینا، رنگ لائیں گی خُدا کے فضل سے
یہ ہماری عسکری پامردیاں اَب کے برس
حضرتِ راحیل کو اس کی قوی اُمید ہے
ختم ہو جائیں گی دہشت گردیاں اب کے برس

اِسی طرح ایک اور قطعے میں انور مسعود عالمی سازشوں کو بے نقاب کرتے ہوئے امریکہ کو ہدفِ تنقید بناتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ داعش کا قیام ہو یا کوئی اور دہشت گرد تنظیم اس کے پیچھے امریکہ کا ہاتھ ہی نظر آتا ہے۔

اگر شامل نہ ہوتی اس کی سازش
یہ فتنہ دہر میں برپا نہ ہوتا
نہ کوئی داعش بھی دُنیا میں ہوتی
اگر دُنیا میں امریکہ نہ ہوتا

اب میں ایک دُعائیہ قطعے میں انور مسعود یہ دُعا کرتے ہیں کہ پاکستان میں امن وامان قائم ہو جائے اور اس کی خوبصورتیاں نکھر آئیں۔

یارب میرے وطن کو عطا کر وہ رنگ رُوپ
ہوتا ہے رنگ رُوپ جو فصلِ بہار کا
میرا وطن ہو اِتنا حسیں جس کے سامنے
منظر بُجھا بُجھا ہو سمندر کے پار کا

انور مسعود دہشت گردی کے کسی بھی واقعے کو جو وہ پاکستان کے کسی بھی شہر، قصبے یا قریے میں رونما ہوا ہو۔کفِ افسوس ملتے ہیں اور خاص طور پر تو زِندہ دِل لاہور کو لہولہان ہوتا دیکھ کر اظہارِ غم کے لئے اُن کے

الفاظ اُن کا ساتھ نہیں دیتے۔ وہ اس بات پر افسردہ دِکھائی دیتے ہیں کہ ماحول اور فضا دہشت گردی کی وجہ سے کرب انگیز ہو چکی ہیں۔

اک صفِ ماتم بچھی ہے ملک کے ہر شہر میں
کتنا کرب انگیز ہے یہ واقعہ لاہور کا
لفظ تھے ہی نہیں اظہارِ غم کے واسطے
کس قدر ہے رُوح فرسا سانحہ لاہور کا

انور مسعود حالاتِ حاضرہ پر کڑی نظر رکھتے ہیں اور خارجہ پالیسی میں امریکہ کے کردار کو دیکھتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ امریکہ ہوس اور لالچ کی انتہاؤں کو چھو چکا ہے وہ دُنیا کے تیل کا پیاسا اور دولت کا پُجاری ہے۔ چونکہ وادیء کشمیر میں نہ تو تیل کے چشمے ہیں اور نہ ہی دولت کے انبار۔ اس لئے اس مسئلے کو حل کرانے میں امریکہ دلچسپی یا سنجیدگی اختیار نہیں کرتا۔

اپنے لشکر لے کے اَب تک وہ یہاں پہنچا نہیں
کچھ سبب ہو گا نا انکل سام کی تاخیر کا
انور اس وادی میں کوئی تیل کا چشمہ نہیں
اس لئے لٹکا ہوا ہے مسئلہ کشمیر کا

انور مسعود سانحہ آرمی پبلک سکول پشاور کو بھی بڑی باریک نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ اپنے قلم کو اِن معصوم بچوں کو خراجِ تحسین پیش کرنے سے نہیں روک سکتے۔ جن کی میتیں اُن کے بستوں کے ساتھ پڑی ہوئی ہیں۔ اُن کے والدین اُن کی معصوم شہادت کی وجہ سے غم سے نڈھال ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ بچے مکتب نہیں گئے بلکہ مقتل گئے تھے۔ جہاں وحشی درندوں نے اُن کے جسموں کو بارود سے نشانہ بنایا۔

کِن بھیڑیوں نے اِن کے بھنبھوڑے ہیں تن بدن
لگتا ہے یوں کہ یہ کسی جنگل سے آئے ہیں
بستوں کے ساتھ ساتھ ہیں بچوں کی میتیں
مکتب سے آئے ہیں یا کسی مقتل سے آئے ہیں

خود کش بمبار کا حملہ مساجد پر ہو، امام بارگاہ پہ یا کسی بزرگانِ دین کے مزار پر۔ انور مسعود کا قلم یہاں بھی غم جذبات کی کیفیت میں ڈوب کر لفظوں کی چیخیں قاری کے کانوں تک پہنچانے کا فریضہ سرانجام دیتے

ہیں۔ اُن کے قلم سے رستہ ہوا خون تنقید نگاروں کو دعوت دیتا ہے کہ آؤ دیکھو میرا تخلیق کار اپنے ہنر کو آزمانے کے لئے کس مشکل میں پھنسا ہوا ہے۔ اپنے قطعے "درگاہِ عثمان مروندی پر" میں وہ لکھتے ہیں۔

لکھا جاتا نہیں احوال اس کا
یہ ایسا سانحہ برپا ہوا ہے
سنی جاتی نہیں لفظوں کی چیخیں
قلم سے بھی لہو رِسنے لگا ہے

منتخب شدہ قطعات سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ ملکِ عزیز کے شاعروں نے دہشت گردی کے عناصر کا قلع قمع کرنے کے لئے لفظوں کی سرحد پر گھمسان کی جنگ چھیڑ رکھی ہے۔ ہر حادثہ، سانحہ یا دھماکے کے بعد شاعر اپنے قلم کے گوریلے بدن اور زخمی ذہن کے ساتھ ملکی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کے لئے اپنے قلم کو ہتھیار بنا کر اپنے شانے پر رکھ کر یہ اعلان کرتا ہے کہ دہشت گردی کے خلاف اس جنگ میں جیت میری ہے۔ یہ جنگ میں اپنے حرفوں سے، لفظوں سے، شعروں سے اور نظموں سے جیتوں گا۔

و: آزاد / نثری نظمیں

نثری نظمیں اُردو نظم کی جدید شکل ہے۔ نثری نظم میں ہیت اور موضوعاتی اعتبار سے کئی تجربے کیے گئے ہیں۔ اس نظم میں ماضی سے بغاوت، نئے انداز اپنانے کو فوقیت، نئے سائنسی افکار کو اپنانا، جمود کے مقابلے میں حرکت اور جہد کو اہم گردانتے ہوئے نئے نئے خیالات اور تصورات کو اُردو میں سمونا اِس نظم کی خصوصیت سمجھا جاتا ہے۔

آزاد نظم ہیت کے لحاظ سے ارکان کی بجائے آہنگ پر زور دیتی ہے جب کہ نثری نظم آہنگ کو بھی خاطر میں نہیں لاتی۔ احمد شمیم، نصیر احمد ناصر اور کئی ایک دُوسرے آزاد اَور نثری نظم کے نمائندہ شعرا میں شامل ہیں۔

یہاں یہ بات محلِ غور ہے کہ دہشت گردی اور اس سے متعلقہ موضوعات کے اظہار کے لئے شعرا نے سب سے زیادہ انہی اصناف یعنی آزاد نظموں اور نثری نظموں کو ہی منتخب کیا ہے۔ اور انہی میں طبع آزمائی کی ہے۔ شاعر اِس کی ایک وجہ تلامذہِ خیال کو من و عن پیش کی آسانی ہے۔ اِن نظموں میں شاعروں نے اُن تمام موضوعات کو پیش کیا ہے جن کا گزشتہ سطور میں احاطہ کیا جا چکا ہے۔ تاہم ذیل میں اُن منتخب نظموں کا حوالہ

پیش کیا جاتا ہے جو آزاد یا نثری صنف کے حوالے سے دہشت گردی اور اس سے متعلقہ موضوعات کی نمائندہ نظمیں ہیں:

احمد ندیم قاسمی کی "ملبہ"، "مجھے مایوس ہونا نہیں آتا"، افغانستان"، "ایشیائی"، "شہر اور شر"، ابھی بند مُٹھی نہ کھولنا"، "طاقت"، "ظلمِ عظیم"، مژدہ"، "عناصر"، "اَے خُدا" اِس موضوع کی حامل نمائندہ آزاد اور نثری نظمیں ہیں۔ امجد اسلام امجد کی نظمیں جن میں "بس ایک دھماکہ ہونا ہے"، "گرتی ہوئی دیوار"، "پاک ہند دوستی کا گیت"، تم زِندہ ہو"، "گیارہ ستمبر"، "مہلت"، "مراجعت"، "یہ کون لوگ ہیں" اس موضوع کی حامل نمائندہ آزاد اور نثری نظمیں ہیں۔ سلیم کوثر کی "کیوں ڈرتے ہو"، "کھڑکی کھول لو"، "اے شہر میرے، اے دل میرے"، "منصوبہ بندی"، "تازہ خبر"، "ہوا بند ہے"، "سوال"، "زندگی کے باب کا ورق ورق گواہ ہے"۔ کشور ناہید کی "🗀🗀 / 🖸~۔۔۔امریکہ ہم تمہارے غلام ہیں"، "فلوجہ کے دروازے پر کھڑی نظم"، "امریکی بھینسے"، "یہ ماتم وقت کی گھڑی ہے"، "بے نظیر تیری وصیت"، "خودکش حملہ کرنے والے بچے کے نام۔۔۔ماں کے آنسو"، "میری پوتی کو انسان رہنے دو"، "بُرقعے میں پھانسی دینے والوں کے نام"، "میرے اندر۔۔۔باہر ہو"، "دوراہا"، "پسِ پردہ"۔ جلیل عالی کی "پری ایمپشن"، "القلم"، "اجارہ"، "فرار"۔ جواز جعفری کی "مجھے کوئی شہر قبول نہیں کرتا"، "میں جنگ کی بارات کا دولہا ہوں"، "نصف صدی، ساڑھے تین جنگیں"، "علم ہمیں ہلاک کر رہا ہے"، "یو این او"، سفر میرے پاؤں میں کھجلی کرتا ہے"، "لکیر کے آر پار بسنے والی اُداس لڑکیو!"، "زمین کے نئے جنم کا گیت"، "میری وصیت میری نظمیں ہیں"، "خدا اور انسان"۔ سید مبارک شاہ کی "بیوروکریسی"، "مگر ہم نے بتانا ہے"، "کیا کچھ توڑا جا سکتا ہے"، "نہیں میں رو نہیں سکتا"۔ نصیر احمد ناصر کی "بون فائر"، "خودکش"، "نئے گوتم کا اپدیش"، "اگر مجھے مرنا پڑا"، "غت رَبود"، "ہر جانب قبریں ہی قبریں ہیں"۔ فاخرہ بتول کی "خون کی ہولی بند کرو تم"، "خودکشی"، "کب تک"۔ روش ندیم کی "ڈگری، سوٹ اور سگرٹ"، "اَن کہی آیات کی تلاوت"، "ذہن کا پی سی وَن"، "بند کواڑوں کے اُس طرف"، "اخبار سے شیشے تو صاف کیے جاسکتے ہیں"، "بریکنگ نیوز"، "شہر مسلسل کھانس رہا ہے"، "می لارڈ! میں تمہیں خبر دار کرتا ہوں"۔ خرم خرام صدیقی کی "کتنا خون بہا دو گے؟"، "آندھی"۔ ارشد سید کی "اور جنگ جاری ہے"، "ہم نہیں ہیں لہو سینچنے والے تیرے"۔ شہزاد نئیر کی "قتلِ گُل"، "خودکش"، "وزیرستان"، "اندر کی جنگ"، "سانحہ پہ سانحہ اور عید"، "اے میرے سوچنے والے بیٹے"۔ اوصاف شیخ کی "آدم خور قبیلے والو"، "انہونی"، "اپنی سالگرہ پر ایک ادھوری نظم"، "دیوار پر لکھی

ایک نظم"، "بوسنیا"۔ ذیشان ساحل کی "دہشت گرد شاعر"۔ عذرا عباس کی "آؤ گنیں کتنے مارے گئے"، "دور تک پھیلی ہے دھُند"، "ہم تصویریں کھینچ رہے ہیں"۔ مقصود وفا کی "برگد ویران ہے"، "کراہتا ہوا سُخن"، "لہو نچوڑتی خبریں"، "بے آباد"۔

ارشد معراج کی "کینوس پر پھیلی اُداسی"، "اب کس کی باری ہے"، "راستوں کی اوکII"۔ سدرہ سحر عمران کی "آگ اور خون ہمارے قوم تہوار ہیں"، "مُٹھی بھر جہنم"، "بلت کار"، "ہم سے کس وطن کا حساب لیا جائے گا"، "زندگی سے خارج لوگوں کا کوئی عالمی دن نہیں"۔ علی اکبر ناطق کی "ہم ہار جائیں گے"، "لہار جانتا ہے"، "کانچ کا شہر"۔ سیما غزل کی"، "پھر نئے سانحہ کا جنازہ پڑھیں"، "جیوے پاکستان"۔

علی محمد فرشی کی "کاش ہم زندگی استعمال کر لیتے"۔ رفیق سندیلوی کی "اِسی آگ میں"۔

جبار واصف کی "مقتل"۔ مذکورہ بالا تمام نظمیں متعلقہ موضوع کے حوالے سے نمائندہ آزاد اور نثری منظومات ہیں۔

حوالہ جات:

1۔ www.facebook.com/amjadislamamjad ، اگست ، pm

۔ امجد اسلام امجد، یہیں کہیں، جہانگیر بک ڈپو، لاہور، ، ص

۔ امجد اسلام امجد، اُردو برائے جماعت نہم، مشمولہ ، چوہدری غلام رسول اینڈ سن، لاہور، ،

ص

۔ کشور ناہید، وحشت اور بارود میں لپٹی ہوئی شاعری، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ، ص

۔ ایضاً، ص

۔ جواز جعفری، موت کا ہاتھ کلائی پر، فکشن ہاؤس، لاہور، ، ص

۔ ایضاً، ص

۔ ایضاً، ص

۔ www.facebook.com/ausafsh، جون ، pm

۔ www.facebook.com/ausafsh، جون ،

pm

۔ www.facebook.com/alimuhammadfarshi، جولائی ،

pm

۔ www.facebook.com/shahzadnayyar، جنوری

pm،

۔ www.facebook.com/fakhrabatoolnaqvi، نومبر ،

pm

۔ www.facebook.com/fakhrabatoolnaqvi، نومبر ،

pm

15۔ میجر حسان طاہر، ماہنامہ ھلال، شمارہ 12، جلد 53، دسمبر 2016، ص 40

16۔ ایضاً، شمارہ 6، جلد 51، دسمبر 2014، ص 38

17۔ تنویر دانش، خواب کے درد انوکھے، رو میل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، 2008، ص 40

18۔ سید مبارک شاہ، جنگل گماں کے، اشاعت سوم، بک ہوم لاہور، 2014، ص 128

19۔ کشور ناہید، وحشت اور بارُود میں لپٹی ہوئی شاعری، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2009، ص 51

20۔ جلیل عالی، عرضِ ہنر سے آگے، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، 2007، ص 136

21۔ www.facebook.com/shafiqrao، 10 اکتوبر 2015، 7:47 pm

22۔ https://youtu.be/RKPIQb8-WfE، 22 مئی 2018، 8:01 pm

23۔ https://youtu.be/cRfdLD1e2wO، 22 مئی 2018، 8:07 pm

24۔ https://youtu.be/NSPXU8Kzs_Y، 22 مئی 2018، 8:13 pm

25۔ https://youtu.be/tBDi_t5LE1c، 22 مئی 2018، 8:21 pm

26۔ https://youtu.be/Pr5z_jiaCpO، 22 مئی 2018، 8:31 pm

27۔ https://youtu.be/wUQeQ400_cs، 22 مئی 2018، 8:39 pm

28۔ https://youtu.be/Ea4RXRwG_yl، 22 مئی 2018، 8:47 pm

29۔ https://youtu.be/jUnKg40bVGw، 22 مئی 2018، 9:02 pm

30۔ https://youtu.be/euVogfXKn8w، 22 مئی 2018، 9:11 pm

31۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی اصطلاحات: توضیحی لغت، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2011، ص 176

32۔ کشور ناہید: وحشت اور بارود میں لپٹی ہوئی شاعری، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2009، ص 34

🗏🗏۔ www.facebook.com/shahzadnayyar،🗏جنوری🖮🗁🗀🗏،
🖰🖳🗄🗁pm

🗐🗏۔ www.facebook.com/shahzadnayyar،🗏جنوری🖮🗁🗀🗏،
🖰🖳🗀🖮pm

🗏🗄۔ www.facebook.com/sidrasaherimran،🗄اپریل🖮🗁🗀🗏،
🗁🗁🖳🗁🖮am

⌛🗏۔ www.facebook.com/fakhra batool naqvi، 🗁🗏نومبر🖮🗁🗀🗏،
🗁🗀🖳🗏🗐pm

🖮🗏۔ www.facebook.com/seema ghazal، 🖲🗏 مئی 🖰🗁🗀🗏،
🖮🖳🗐🖰pm

🖰🗏۔ www.facebook.com/ausafsh، 🗁🗁جون🗄🗁🗀🗏،
🖮🖳🗏🖲pm

🖲🗏۔ حمزہ ہاشمی سوز، ماہنامہ بیاض، لاہور، شمارہ جنوری، 🖮🗁🗀🗏، صف🗐🖲

🗀🗐۔ اعجاز احمد، قلمی نسخہ، مخزونہ، مملوکہ، اعجاز احمد، پشاور

🗁🗐۔ ایضاً

🗏🗐۔ www.facebook.com/junaidazar،⌛🗏اگست🗄🗁🗀🗏،pm🖮🗐🖳⌛

🗏🗐۔ www.facebook.com/seemaghazal، 🗀🗁جون 🖮🗁🗀🗏،
🗁🗀🖳🗏🗁pm

🗐🗐۔ www.facebook.com/rayeshoukatwara، 🗁🗏جنوری
🗐🗁🗀🗏،am🗄🗐🖳🖲

🗄🗐۔ ناصر بشیر، روزنامہ پاکستان، لاہور، 🖮جون⌛🗁🗀🗏، ص🗏

⌛🗐۔ www.facebook.com/ariffarhad، 🗏🗁اگست ⌛🗁🗀🗏،
🗁🗀🖳🗏🗏pm

🖮🗐۔ شہباز انور خان، روزنامہ ایکسپریس اسلام آباد، 🗄🗏جولائی🖮🗁🗀🗏

۔ جمشید چشتی، ماہنامہ بیاض، لاہور، شمارہ مئی، ص

۔ www.facebook.com/aitbarsajid ، دسمبر ،

pm

۔ www.facebook.com/yousafhassan ، مئی ،

pm

۔ انور شعور، روزنامہ جنگ راولپنڈی، اگست

۔ http://universalurdupost.com/poetry/17909، دسمبر

am،

۔ ایضاً، دسمبر، am،

۔ انور مسعود، روزنامہ ایکسپریس اسلام آباد، جنوری

۔ ایضاً، جنوری

۔ ایضاً، مارچ

۔ ایضاً، اکتوبر

۔ www.facebook.com/anwarmasoodofficial ، ستمبر ،

pm

۔ ایضاً، دسمبر، pm،

۔ انور مسعود، روزنامہ ایکسپریس، اسلام آباد، فروری

باب چہارم: اُردو نظم کے فن اور تکنیک پر دہشت گردی کے اثرات

فن کا بنیادی مقصد تو کسی بھی اختراع اَور تخلیق کے ذریعے فرحت اور مسرت مہیا کرنا ہے تاہم فن جس کی کوئی واضح توضیح نہیں کی جاسکتی البتہ فن کے حقائق کا جائزہ لیا جائے تو فن زندگی یا حقیقت کی ترجمانی کا ذریعہء اظہار ہے۔ مزید یہ کہ فنِ سماج کے شعود کی بنیاد اور فن کار کی اپنی شخصیت کا پرتو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دہشت گردی کی پھیلتی ہوئی حالیہ لہر نے بھی فن اور فنکار پر اپنے اثرات چھوڑے ہیں کیونکہ ابو الاعجاز صدیقی کے مطابق:

> فن فنکار کی اپنی شخصیات کا پرتو جس میں اس کا
> سماجی شعود بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ 🗁

اُردو نظم جیسا کہ ہر زمانے میں ہی اپنے معاشرے کا عکس رہی ہے۔ اکیسویں صدی میں بھی اپنی روایت سے مربوط ہے۔ معاشرے میں بڑھتی ہوئی قتل و غارت نے شاعری کے علائم و رموز پر بھی اپنے اثرات چھوڑے ہیں۔ پھول کی پتی، محبوب کے عشوہ اور حسن کی رعنائیوں سے اُردو نظم کا فن دہشت، وحشت اَور شدت کی طرف راغب و مائل دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس بدولت جہاں فن اَور فن کار کے زاویہ نگاہ میں تبدیلی واقع ہوتی ہے وہاں تکنیک نے بھی کئی کروٹیں لی ہیں۔ تکنیک کی وضاحت میں ابو الاعجاز صدیقی رقمطراز ہیں:

> تکنیک سے مراد وہ طریقہ کار ہے جس سے
> فنکار اپنے موضوع کو پیش کرتا ہے۔ 🗎

پاکستانی معاشرے میں بڑھتی ہوئی قتل وغارت، دہشت گردی، خودکش دھماکوں، ٹارگٹ کلنگ، ٹائم بم کے دھماکوں، قاتلانہ حملوں، مسجد اَور امام بارگاہوں پر حملوں، سرکاری املاک پر قبضوں اَور اس طرح کے دیگر واقعوں میں اُردو نظم کے شاعر نے بھی حق گوئی اور صداقت کا جو پرچم بلند رکھا ہے یقیناً اس سے نظم کے

فنِ تکنیک اور اسلوب پر بھی نمایاں تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ چونکہ یہ موضوع راست بازی کا تقاضا کرتا ہے اور شرعی ملائمت سے وہ بچ کر حساسیت کو بیان کرنے کا متقاضی ہے۔ اسی لئے نظم کے شعرا نے اپنی تکنیک اور اسلوبیات میں بھی سادگی اور سلاست کو ہی چن کر ڈکشن کے سیدھے سادھے انداز کو اپنایا ہے۔ انوکھی اور پیچیدہ تراکیب سے صرفِ نظر برتتے ہوئے، لچھے دار لفاظی سے احتراز برتنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ نظم کے شعرا کی حتی الامکان کوشش ہے کہ بات کو مقصدیت کی حد تک قابلِ فہم اور قابل اِدراک بنایا جائے اور ایک واضح طریقہء اظہار سے اپنا مافی الضمیر بیان کیا جائے تاکہ شاعری کے ذریعہ عوام کو حق بات سے آگاہی ہو اور دہشت گردی کے اس ماحول میں پس پردہ عناصر کو بے نقاب کیا جاسکے۔

یہی وجہ ہے کہ روش ندیم اپنے نظمیہ تصنیف "دہشت کے موسم میں لکھی نظمیں" میں شاعر کے بیانیہ میں صداقت کے پرچار پر بہت کھلے اور واضح لفظوں میں زور دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ شاعر نے بھی نئے زمانے کے دکھ کو صداقتی اظہار نہ دیا تو اس کی شاعری کا ایک ایسا انجام ہوگا جو ایک مجرم کا ہوتا ہے۔ اپنی نظم "درد کی شعریات 2" میں وہ یہی بات بیان کرتے ہیں کہ ایسے حالات میں اگر شاعر منافقت کا سہارا لینے کا سوچتا بھی ہے اور حق و صداقت کا ساتھ نہیں دیتا اور روایتی ادب کا ہی پرچار کرتا ہے اور کھلے لفظوں میں دہشت اور وحشت کو ناجائز قرار نہیں دیتا تو وہ شاعرانہ دہشت گردی کرتا ہے۔

لیکن حق گوئی کے اس بیان میں اربابِ اختیار کی طرف سے یا ان لوگوں کی طرف سے جن کے خلاف شاعر کھلے لفظوں میں لب کشاں ہوتا ہے، اپنی نامعلوم قوتوں کی جانب سے شاعر کی زبان بندی کے لئے دباؤ ڈالا جاتا ہے۔ اسے معاشرے سے الگ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس کو خاموش رہنے پر اکسایا جاتا ہے۔ لیکن شاعر تو زمانے کی آواز ہوتا ہے۔ وہ ظلم تو سہتا ہے لیکن منافقت سے کام نہیں لیتا۔ وہ زمانے میں اس آواز دبانے والوں کے خلاف کھلے لفظوں میں اظہاریہ بن جاتا ہے۔ وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ:

میں نے چند نظمیں کیا لکھیں،
تم نے مجھے اشتہاری قرار دے دیا!
سن لو میں دہشت گرد نہیں ہوں، ایک شاعر ہوں
امن، محبت اَور عدل کا
بغاوت، انقلاب اور غداری کا
میں نظمیں لکھوں گا اور تمہیں برباد کر دوں گا

الف۔ علامات

لفظ "علامت" شاعرانہ حوالوں سے دو معانوں میں استعمال ہوتا ہے۔ علامت بطور استعارہ یعنی سمبل(Symbol)اور علامت بطور وہ زبان جو لغوی حدود و قیود سے ماوراظاہری مطالب و معانی سے بڑھ کر دیگر باطنی یاپوشیدہ مطالب کو اشارتاً بیان کرنے پر اصرار کرے۔ اول الذِکر "علامت" کے متعلق ابوالاعجاز حفیظ صدیقی لکھتے ہیں:

> کسی لفظ کا مجازی مفہوم ہی دراصل علامتی مفہوم ہے۔ مجاز کے لغوی معنی ہیں تجاوز کرنا جب کوئی لفظ اپنے اصل لغوی مفہوم سے آگے بڑھ کر کسی دوسرے مفہوم کی نشاندہی کرنے لگتا ہے تو وہ مجاز کہلاتا ہے۔ انگریزی لفظMetaphor یونانی الاصل ہے اس کا مفہوم بھی یہی ہے یعنی اآگے بڑھانا۔[1]

اس ضمن میں دوسرا مفہوم قابلِ توجہ ہے یعنی علامت سے مراد وہ زبان جو ظاہری مطالب سے بڑھ کر پوشیدہ مطالب بیان کرنے پر اصرار کرے اور اس باب میں ہمارا مقصد بھی مؤخر الذکر مفہوم کے حوالے سے اردو شاعری میں ہونے والی تبدیلیوں کا جائزہ لینا ہے جو دہشت گردی کے حالیہ واقعات کے بعد وقوع پذیر ہوئیں۔ جبکہ علامت بطور استعارہ کا ذکر آگے چل کے کیا جائے گا۔

اُردو شاعری ابتدا ہی سے اپنے علائم و رموز کی وجہ سے اپنے معنوں میں وسعتیں پیدا کرتی رہی ہے اور گل و بلبل کے علائم سے لے کر آشیانہ و قفس اور پھر بعد ازاں دار و رسن کے علائم سے باریکیاں پیدا کرتی رہی ہے۔

بڑے شعرا بھی اپنی علائم و رموز کو پے در پے استعمال کرتے رہے اور ان میں نئی نئی جہتیں اور پہلو نکالتے رہے۔ ڈاکٹر روش ندیم نے روزنامہ "جناح" کے ایک انٹرویو میں کہا تھا:

> شاعری محض لفظیات نہیں، کسی بھی تہذیب کا فنی اور جمالیاتی بیانیہ ہے نظم آج کے تعقل پسند پیچیدہ جدید سماج کی نمائندہ شعری صنف ہے۔[2]

یہی وجہ ہے کہ وہ تمام شاعری بالخصوص نظمیہ شاعری جو دہشت گردی کے موضوع کو برتنے کے لئے کی گئی ہے۔ اس کی زبان اس میں موجود علامتیں اور زمزیہ اور رزمیہ لہجہ بہر طور تفکر، تدّبر اور تیقّن کو جلا بخشتا ہے اور قاری کو متذکرہ علائم کے سمجھنے پر اکساتا ہے۔

سید مبارک شاہ، اپنی نظم "الم ترکیف" میں لکھتے ہیں:

رَب کعبہ تجھے ترے گھر کی قسم
جو سلامت رہا اور سلامت رہے
تا قیامت رہے
میرے برباد شہروں کی فریاد سن
ابرھہ کا جہاں لشکرِ فیل ہے
ہم کو پھر انتظارِ ابابیل ہے۔ ⏳

سید مبارک شاہ کی علامتیں جذبات کی رو میں خدا کو جھنجھوڑنے سے بھی دریغ نہیں کرتیں اور وہ اپنی بات کو شدت سے بیان کرتے ہیں اور ایک جذباتی کیفیت کے قائم کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ اپنی نظم "تعزیت" میں لکھتے ہیں:

سہتا نہیں ہے ضبط بھی جس غم کے دار کو
اس سانحے سے اس طرح اجڑا ہے لامکاں
چپ لگ گئی ہے کرب سے پروردگار کو ⌨

سدرہ سحر عمران دہشت گردوں کے حملوں سے زخمی ہو جانے والوں کو لے جانے والی ایمبولینس کا شور برداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے بہرہ ہونے کی آرزو کرتی ہیں۔ وہ ایمبولینس کے شور کو موت کی موسیقی قرار دیتی ہیں۔ نظم "ہمیں مرنے کی ریہرسل کرنے دو" میں وہ لکھتی ہیں۔

جب گہری کھائیوں سے کسی کے چیخنے کی
آواز آتی ہے
ہم ہتھیلی پر ایمبولینس بناتے ہیں
بیساکھیاں اونچے نیچے رستوں پر
جھک کے چلتی ہیں
تو بادل ہمارا ہاتھ پکڑ کر بھاگنے لگتے ہیں
پہاڑ ہمیں ایسے گھورتے ہیں
جیسے ان کے پاؤں میں زنجیریں ہم نے ڈالی ہوں
کوئی ہمارے کانوں پہ پردہ بھی تو ڈال سکتا ہے

کیا ضروری ہے
کہ ہمارے جسم کونوں کھدروں میں ڈال کر
موت کے گیت گائیں جائیں
ہم بہرے بھی تو ہو سکتے ہیں۔

سدرہ سحر عمران جابجا بہتے خون کی وجہ سے سرخ رنگ سے ہی متنفر ہیں۔ وہ ہر اس شخص کو جو کشت و خون کا باعث بنتا ہے۔ زمین میں دفن کرنے کی خواہش مند ہیں۔ وہ علامتی لفظوں میں اس کیفیت کو اپنی نظم "محبت نامے سے پہلے لکھی ہوئی جنگ" میں یوں بیان کرتی ہیں:

ہم اجتماعی قبروں کا حصّہ نہیں بننا چاہتے
ہمیں سرخ رنگ سے نفرت کے اظہار کے لئے
زمین کی مُٹھی کھول کر رکھ دینے چاہیے
وردی کے کاندھوں پر کھڑے ہوئے لوگ
جو خواب میں دیکھتے ہیں
شہر میں لوگوں کی جگہ بارود کا چلنا پھرنا

نوید ملک "پشاور کے معصوم شہدا کے نام" اپنی نظم میں ماہِ دسمبر کی علامت استعمال کر کے اس کے سرد لمحوں میں خون کی آمیزش کی وجہ سے ان عکسوں کو منجمد دیکھتے ہیں۔ جو اس سانحے کی بدولت ہر آنکھ ساکت کیے ہوئے ہیں۔

عجب آیا ہماری زندگی میں اک دسمبر
کہ اس کے سرد لمحوں نے
نگاہوں میں لہو سے تر، کچھ ایسے عکس
گاڑے
جو اب تک منجمد ہیں
پگھلتے ہی نہیں ہیں۔

عائشہ بیگ عاشی "سقوطِ ڈھاکہ" اور "دہشت گردی" کی وجوہات کو یکساں دیکھتی ہیں اور اپنی نظم "ملکی صورتحال کے تناظر میں" دونوں سانحات کا ذمہ دار حکمرانوں کو قرار دیتی ہیں۔ ان کے یہ علائم بہت واضح ہیں۔

سمجھو سقوطِ ڈھاکہ عبرت نشاں اب تک
حیراں ہوں تعصب ہی اک زباں ہے اب تک
نااہل حکمران کی تادیل کس لئے ہے۔
انسانیت کی اتنی تذلیل کس لیے ہے۔ 🗁🗁

فاخرہ بتول روایتی کربلائی علائم کو بیان کرنے میں اپنی مثال آپ ہیں۔ وہ دہشت گردی کی وجہ سے پیدا ہونے والی صورت حال کو کربلا کا ہی ایک معجزہ قرار دیتی ہیں۔ اور موقف اختیار کرتی ہیں کہ دہشت گردی کا جو آغاز کربلا سے ہوا تھا۔ اب تک جاری ہے۔ اُن کی نظم "کب تک" میں یہی علامت رقم ہے:

ظلم بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے یہ بات نہ بھول
اب کے لگتا ہے کہ مٹنے کی گھڑی دور نہیں
ہم ہیں بے بس وہ خُداوند ہے مجبور نہیں
کربلا آج بھی زندہ ہے یہی معجزہ ہے 🗁🗎

ساہیوال کے کالم نویس اور شاعر اوصاف شیخ اپنی سالگرہ پر لکھی جانے والی نظم مکمل نہیں کر سکتے کیونکہ ان کا فن، ان کی سوچ اور ان کی زبان خود کش بمبار کے حملے کی خبر سے انفرادی دُکھ سے اجتماعی دُکھ کی طرف مڑ جاتی ہے۔

کھڑکی پر اک نظم کی دستک
دروازے پر پھول کی آہٹ
روشن دان سے دِن کی آمد
کان میں اِک سُریلی سی
مدھم سرگوشی
سالگرہ مبارک جاناں
رات یہ میں نے سب سوچا تھا
رات یہ میں سب چاہا تھا
لیکن میں نے کب سوچا تھا
لیکن میں نے کب چاہا تھا
روشن دان سے دِن کی آمد

اپنے ساتھ یہ خبر بھی لائے

ایک دھماکہ۔۔۔

اِک خود کش بمبار کا حملہ

الغرض متعلقہ موضوع نے اُردو علائم پر بھی اپنا اثر ڈالا ہے اور زبان و بیاں کو نئی جہتیں فراہم کی ہیں۔

ب: اصطلاحات

متعلقہ موضوع کو برتتے ہوئے موضوع کی مناسبت سے شعرا کرام نے دہشت گردی کے اس میدان کی اصطلاحات کو بڑی شد و مد کے ساتھ تلامذہ خیال میں لایا ہے اور اسے صفحہ قرطاس پر بکھیرنے میں کسی حیل و حجت کا مظاہرہ نہیں کیا ہے۔

اصطلاحات دراصل وہ الفاظ ہی ہوتے ہیں جو اپنے معانی و مطالب کے اعتبار سے کسی علم، کسی فن یا کسی مخصوص شعبہ کے مخصوص معانوں میں مستعمل ہوں۔ اصطلاحات کا تحریر میں استعمال معانی کی جمع آواری کا کام دیتا ہے۔ دریا کو کوزے میں بند کرنے کا فریضہ در حقیقت اصطلاحات کی بدولت ہی سر انجام پاتا ہے۔ اگر مخصوص کلام و فنون یا شعبہ ہائے جات کی توضیح میں اصطلاحات کا استعمال نہ ہو تو بات کو بیان کرنے کے لئے بار بار لفظی طوالت کا سہارا لینا پڑے۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی نے اپنی مشہورِ زمانہ "کشاف تنقیدی اصطلاحات" میں وحید الدین سلیم کو نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> اصطلاح کی ضرورت ایسی نہیں کہ لوگ آگاہ نہ ہو۔ اگر اصطلاحیں نہ ہوں تو ہم علمی مطلب ادا کرنے میں طول لاطائل سے کسی طرح نہیں بچ سکتے۔ جہاں ایک چھوٹے سے لفظ سے کام نکل سکتا ہے۔ وہاں لمبے لمبے جملے لکھنے پڑتے ہیں۔ لکھنے کا وقت جدا ضائع ہوتا ہے اور پڑھنے والے کی طبیعت جدا ملول ہوتی ہے۔

اُردو شاعری میں بالخصوص نظم کے حوالے سے شعرا نے دہشت گردی سے متعلقہ اصطلاحات مثلاً بارود، دھماکہ، جیکٹ، خود کش بمبار، شعلہ، ملبہ، بھگدڑ، جنت، نعرہ تکبیر، لاش، خون، سانحہ، حملہ آور، خنجر، جبر، زخمی، چیتھڑے، قفس، وحشت اور دہشت وغیرہ کو نا صرف ڈکشن بلکہ بطور اصطلاح کے بھی استعمال کیا ہے۔ شعرا کا قلم اس لفظ دہشت گردی کے لیے روایتی ملائمت کے بیان کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ نظم میں شاعر اس موضوع کی مناسبت سے ہی بڑی شد و مد کے ساتھ ایسی لفظیات کا چناؤ کرتا ہے جو دہشت کے ساتھ وحشت کو جنم دیتے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی نے جنوری 2000 میں اکیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی جو نظم "ملبہ" لکھی اس میں دھول، چیخ، خنجر اور آرے جیسی اصطلاحات کے استعمال سے اکیسویں صدی میں داخلے کو ایک ہچکچاہٹ قرار دیا۔ وہ لکھتے ہیں:

مجھے گزری صدی لیکن گزرنے ہی نہیں دیتی
کہ اس کا ڈھیروں ملبہ چار جانب سے مجھے گھیرے ہوئے ہے۔

امجد اسلام امجد اسی موضوع کو ایک داستانِ جبر مسلسل قرار دیتے ہیں اور اپنی نظم "گرتی ہوئی دیوار" میں لکھتے ہیں:

پرانی ہے بہت یہ داستان جبر مسلسل کی!
میرے آبا نے بھی اس کے بہت سے باب دیکھے ہیں
مرے پرکھوں نے بھی ایسے بہت سے خواب دیکھے ہیں
کہ زنجیریں پگھلتی ہیں۔
گلے کے آہنی طوقوں کی بندش نرم پڑتی ہے۔

9/11 کے المیے کو بیان کرتے ہوئے امجد اسلام امجد افغانستان پر امریکی حملے کو بھی دہشت گردی ہی قرار دیتے ہیں اور نظم "گیارہ ستمبر" میں بہت واضح لفظوں میں اس کی مذمت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

بموں کے دھماکوں سے اور اپنی طاقت کی ننگی نمائش سے
سہمے ہوئے کوہ و صحرا پہ وہ حبس
قیامت کی بارش کیے جا رہا ہے
وہ اس کے مقابل میں گردِ سرِ رہ سے بھی ہیچ تر ہے۔

کشور ناہید تو خوب اصطلاحاتِ دہشت گردی کی اہمیت سے واقف ہیں۔ انہوں نے تو اپنی کتاب کا نام ہی "وحشت اور بارود میں لپٹی ہوئی شاعری" رکھ کر متعلقہ موضوع کی اہمیت کو جتلایا ہے۔ وہ جابجا اصطلاحاتِ دہشت گردی کو بطور ڈکشن اپنی نظموں میں استعمال کرتی ہیں۔ اپنی نظم "/---امریکہ ہم تمہارے غلام ہیں" میں وہ کہتی ہیں:

ظلم کے زمانے میں
گردنیں کہ کٹتی ہیں

خون ہے کہ بہتا ہے
شہر ہے کہ مٹتے ہیں
بستیاں اجڑتی ہیں
ہر سڑک کی نکڑ پر
روشنی کی گلیوں میں
خوف بچھتا جاتا ہے۔

کشور ناہید اپنی نظم "گو انتاناموبے کی دہلیز پر رکھی ہوئی نظم دھندلی ہے" میں رگوں میں خون منجمد، مردہ شیر، زندہ کتے، چاقو کی نوک، گیس چیمبر، خاردار تاروں اور وردی جیسی بے باک اصطلاحات استعمال کر کے ظلم و جبر کے خلاف اپنے مظلوم بھائیوں اور اور جنہوں کے لیے جو اس جیل میں بند ہیں آواز بلند کرتی ہیں:

مجھے لگا کہ وہ میرے اندر کا خوف تبدیل کرنے لگے ہیں
تا کہ میرے اندر غصے کی ساری رگوں کو منجمد کر دیں
میرے اندر اُگنے والے بے عزتی کے درختوں کو
جڑوں سے اکھاڑ دیں
اور میرے ہونٹوں سے بے انصافی، بے عزتی اور بے غیرتی
جیسے تمام حروف، چاقو کی نوک سے کھرچ کر نکال دیں۔

اپنی ایک اور نظم "خود کش حملہ کرنے والے بچے کے نام۔۔۔ماں کے آنسو" میں وہ ایک ایسے بچے کی ماں کے جذبات بیان کرتی ہیں جو خود کش بمبار ہے اور دھماکہ کرنے نکل چکا ہے۔

مجھے تو یہ بھی یاد نہیں کہ جب تم گھر سے نکلے تھے
تو تمہارے ہاتھ میں رومال تھا
انجانے اور بے ساختہ آنسوؤں کو
پونچھنے کے لئے
کہ تھیلا تھا جس میں بارود بھرا ہوا تھا
یا پھر تمہارے سینے پر موت نے
تمغوں کی صورت میں
ہینڈ گرینیڈ باندھے ہوئے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ کشور ناہید اپنی ان نظموں کے متعلق تذبذب کا شکار ہیں۔ جن میں جنگی، وحشی اور دہشت گردی کی اصطلاحات استعمال کرنے پر مجبور ہیں۔ وہ اپنی نظم "فلوجہ کے دروازے پر کھڑی نظم" میں کہتی ہیں:

میں ان نظموں کا کیا کروں
جن میں سہمے ہوئے زخمی بچوں کے
رونے کی آوازیں گونجتی تھیں
کہ اب ہر طرف کراہیں اور آہیں
میرے کانوں کو چھید رہی ہیں۔ 🗁🗎

اس ضمن میں سید مبارک شاہ "بیورو کریسی" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں اور اپنے اندر کے دُکھ کے بیاں میں بے بس اور بے چارگی کی کیفیت کا اظہار ان لفظوں میں کرتے دکھائی دیتے ہیں جو اُن کی نظم "بیورو کریسی" میں رقم ہے:

خواب کے اندر آنکھ کھلی ہے
اور میں نیند میں چلتے چلتے
ایک ہجوم کے پیچھے پیچھے
اس سیڑھی تک آجاتا ہوں
جس کے ہر زینے کے اُوپر
خون سے لتھڑے ہاتھ اور پاؤں صف آرا ہیں۔ 🗎🗎

سید مبارک شاہ خدائے بزرگ وبرتر کی محض چھے دنوں میں تخلیق کردہ بے کراں کائنات کو محض چند لمحوں میں بکھرتے دیکھتے ہیں تو حیرت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اصطلاح "بارود" کو استعمال کرتے وقت ان کا اچنبھا ختم نہیں ہوتا۔ وہ خدائی طاقت اور انسانی طاقت (بارود) میں فرق روا رکھنے سے قاصر دکھائی دیتے ہیں۔ وہ نظم "کیا کچھ توڑا جا سکتا ہے" میں لکھتے ہیں:

کیا یہ دل، دماغ اور آنکھیں لوتھڑے بن اڑ سکتے ہیں
کیا خالق کے ہاتھ سے گوندھی خاک ہوا میں کھو سکتی ہے؟
کیا بارود میں اتنی طاقت ہو سکتی ہے؟ 🗎🗎

نصیر احمد ناصر اس ضمن میں "نیو ورلڈ آرڈر" کی اصطلاح کا استعمال کرتے ہیں۔ وہ اپنی نظم "نئے گوتم کا اُپدیش" میں نیو ورلڈ آرڈر سے نجات کا طریقہ کار بتاتے ہیں کہ اس سے چھٹکارہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے:

دُکھ ڈائری میں نہیں لکھا جا سکتا
نہ کسی نظم میں ڈھالا جا سکتا ہے
نروان کے فاقوں سے بھی
شانتی نہیں مل سکتی
تاریخ تھک کر ٹھہر گئی ہے
اور دُنیا
نیو ورلڈ آرڈر کے تابع ہو چکی ہے
نجات کے لئے
ہمیں پھر سے
ایک طویل خواب ترتیب دینا ہو گا۔

جو از جعفری واضح لفظوں میں "ایٹم بم" "میزائل" اسلحہ" اور "ہلاکت" جیسے الفاظ کو بطور اصطلاحات اپنی شاعری کا جزو بناتے ہیں۔ ان کا موقف ہے کہ علم کی بدولت جو ٹیکنالوجی انسان حاصل کر رہا ہے دراصل وہ باعث ہلاکت ہے۔ اپنی نظم "علم ہمیں ہلاک کر رہا ہے" میں وہ اِسی خیال کو اِن لفظوں میں پیش کرتے ہیں:

ہم ایٹم بم کو
آدھا نیچے
اَور آدھا اُوپر اوڑھے
اپنے کشکول بدستِ بازو سر پر رکھے
بے خبر سو رہے ہیں
چاروں اوڑھ لہلہاتی بھوک کے درمیان
ہمارے بلکتے بچے
روزانہ دُور مار میزائل چاٹ کر
حب الوطنی کے بوسیدہ ٹاٹ پر

اپنی آنکھوں میں تیر تا نمک چکھ کر

سو جاتے ہیں

ہمارا ہُنر

ہمیشہ ہتھیاروں کو بہتر بنانے میں صرف ہوا

علم ہمیں ہلاک کر رہا ہے۔ 📄

ڈاکٹر روش ندیم ٹارگٹ کلنگ کو دہشت گردی کی اصطلاح کے طور پر نظم "بریکنگ نیوز" میں استعمال کرتے ہیں۔ اُن کے ہاں دھماکہ، ملبہ، مافیہ، تھیوری، بھتہ، ایٹمی موم بتیاں، قاتل، لُٹیرے اور دہشت گرد کی اصطلاحات بھی عام ملتی ہیں۔ وہ شاعری کو محض شاعری نہیں رکھنا چاہتے بلکہ اس سے سیاست اور مقصدیت کا کام لیتے ہیں۔ اور ایسا نہ کرنے والوں پر لعنت بھیجنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ اپنی نظم "احتجاج کی نئی بوطیقا-2" میں لکھتے ہیں:

تُم مقصدیت اور سیاست کو

اَدب سے خارج کرنے کی قرار دادیں پاس کروا رہے تھے

لعنت ہو تم پر! 📄

ج۔ تشبیہات و استعارات

شاعری تشبیہ اور استعارہ کے بغیر نامکمل اَور ادھُوری ہے۔ محاسنِ سُخن میں تشبیہ و استعارہ ہی وہ بنیادی خصائص ہیں جو مافی الضمیر کو جلا بخشنے کا فریضہ سر انجام دیتے ہیں اَور خیالات کو نُدرت اور الفاظ کو مفاہیم ادا کرنے کی قُدرت بخشتے ہیں۔

دہشت گردی سے متعلقہ نظمیں دیکھ کر اس نقطہ کو پذیرائی ملتے دیکھا گیا ہے کہ اُردو شاعری کی روایتی تشبیہات اور استعارات جن میں کبھی پھول، گلاب، گیسو، رنگ، رات، چاند، بدلی، گھٹا، بادل، موتی، آنسو اور اِس طرح کی ان گنت کئی اور بھی ہوا کرتے تھے اِن کی جگہ اَب مزاحمتی اور غیر روایتی الفاظ و تراکیب نے لے لی ہے اَور روایتی ملائم تشبیہات اور استعارات کے برعکس غیر ملائم تشبیہ و استعارہ اُردو نظمِ موضوع کی مناسبت سے در آیا ہے جو کہ عصری شعور کا عکاس بھی ہے اور شعرا کی حساسیت کا آئینہ دار بھی۔ اِس ضمن میں ذیل میں چند امثال تحریر کی جاتی ہیں:

احمد ندیم قاسمی ظلم کی کہانی کے نقوش کابل اور عراق کی تشبیہات استعمال کر کے ڈھونڈتے ہیں۔ اُن کی نظم "ظلمِ عظیم" میں وہ اقوامِ متحدہ کے دفتر کو ابلیس کی راجدھانی قرار دیتے ہیں۔

سن ظلمِ عظیم کی کہانی　　لاشوں کے ہجوم کی زبانی
اِنسان بھی ستم میں کم نہیں ہے　　ہر ظلم نہیں ہے آسمانی
اِس سر کے نقوش کابلی ہیں　　وہ دھڑ ہے عراق کی نشانی
اقوام کی انجمن کا دفتر　　اِبلیسِ زماں کی راجدھانی

امجد اسلام امجد کے ہاں تشبیہات کبھی موت اور رات، تو کبھی لاش کی بدبُو اور دل کی چھپی بات کے مماثل ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنی نظم جس کا عنوان "نظم" ہے میں بیان کرتے ہیں:

اُتری ہے اِن پہ موت کِسی رات کی طرح
بُو چھوڑنے لگی ہے گلی میں پڑی وہ لاش
مُدت سے دِل میں رکھی وہ بات کی طرح

امجد اسلام امجد نظم "ایک سی رعایت میں" درویش اور مجرم میں مماثلتیں تلاش کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔

جیسے ہر درویش کے پیچھے اُس کا ماضی ہوتا ہے
یونہی ہر مجرم کے آگے
اُس کا مستقبل بھی ہے

کشور ناہید اپنی نظم "امریکی بھینسے" میں امریکی فوجیوں کو امریکی بھینسے قرار دیتی ہیں جو ایسے بُل فائٹر ہیں جو وحشی بھینسے کی شہ رگ میں زہر آلود خنجر اُتارتے ہیں۔ کشور ناہید کے استعارے بے باک اور بہانگ ہیں۔ وہ اپنی نظم "پسِ پردہ" میں امریکیوں کو بلیک میلر اور امریکیوں کے پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک میں تسلط قائم کرنے کو چڑیلیں اور بلاؤں سے مماثل کرتی ہیں اور ان کو شیطان سے بڑی مخلوق قرار دیتی ہیں۔ مثال دیکھئے:

مغرب سے آنے والے بوٹ
ہمارے پیروں میں فٹ کیے جا رہے ہیں
چڑیلیں اور بلائیں
پاکستانی فرینکو کے کندھوں پہ چڑھی

بلبلا رہی ہیں
وہ زنجیریں ہلا ہلا کر
کہہ رہی ہیں، وہ نہیں گیا
وہ نہیں گیا، وہ ہمارا گرُو ہے
وہ نہیں جائے گا
وہ شیطان سے بڑی مخلوق ہے

جواز جعفری بارود اور دھماکوں کے بعد اُٹھنے والی تابکاری سے پیدا ہونے والی جلن اور بصری آشوب کو سرمہ لگانے کی سی صورتحال بتاتے ہیں۔ اور ایک عام آدمی کے دکھ کے بیاں کے لئے "جنگ کی بارات کا دولہا" کا استعارہ استعمال کر کے ندرتِ استعارہ کی بنیاد رکھتے ہیں۔

میں--- جنگ کی بارات کا دولہا ہوں
تابکاری میری اداس آنکھوں میں سرمہ لگائے گی
اور اس لمحے
زندگی میرے رخسار پر بجھ جائے گی۔

سید مبارک شاہ کی تشبیہ اور استعارہ اس لحاظ سے منفرد ہے کہ وہ غم کو سینے میں اس طرح قید کر لیتا ہے جیسے کسی کو کمرے میں بند کر کے کنڈی چڑھا دی گئی ہو۔ اپنی نظم "غم تو غم کی دُوری میں ہے" میں بیان کرتے ہیں:

غم دیوار پہ چسپاں ہویا
اخباروں کے بیچ
انجانا اور بیگانہ سا لگتا ہے۔
پر دل کے اندر آجائے تو
آنکھ کو کنڈی لگ جاتی ہے۔
جاگنے والے سو جاتے ہیں۔
غم جب اپنے ہو جاتے ہیں۔

سید مبارک شاہ دھونس' دولت' قبضہ اور سرحدی ہوس کی وجہ محض خود نمائی اور ظاہری نمائش بتاتے ہیں۔

وہ اپنی نظم "نمائش ہے" میں کہتے ہیں:

نمائش ہے
اندھیرے میں نمائش ہے
نمائش میں اندھیرا ہے
اندھیرے میں کئی نادیدہ رنگوں کی نمائش ہے
نمائش ہے نمائش ہے۔

فاخرہ بتول وطن کو "گلشن" کہنے کا روایتی استعارہ استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ گلوں کے مرجھانے کو موت اور معصوم بچوں کو دہشت گردی کا نشانہ بننے کو کلیوں کے مرجھانے سے تعبیر کرتی ہیں۔ دھماکوں سے تباہ ہونے والے گھروں کو گھونسلوں کے اُجڑنے اور معصوم طلبا کو معصوم فرشتے قرار دیتی ہیں۔ اپنی نظم "خون کی ہولی بند کرو تم" میں رقم طراز ہیں:

گلشن کے چہرے پہ دیکھو
موت کی زردی چھائی ہوئی ہے
اور گلوں کی بھینی خوشبو
خوف سے اب مرجھائی ہوئی ہے
کلیوں کی تم کو ملتا کب تک روندو گے؟
کب تک پھولوں کو نوچو گے؟

جلیل عالی کے استعارے اور تشبیہات زیادہ تر تلمیحی ہیں۔ وہ دہشت گردی اور اس سے نبرد آزما ہونے والوں کے درمیان ہونے والی کشمکش کو خیر و شر کا تصادم قرار دیتے ہیں جس کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ نظم "القلم" میں وہ کہتے ہیں کہ وہ ظلم اور دہشت کے خلاف کسی صورت اپنا سر خم نہ کریں گے۔

یزیدی ستم ہوں
کہ فرعونیت کے شکنجے
کہ رزیں طلسمات ہوں سامری کے
کوئی جبر شاہی
کوئی دامِ دانش فروشاں

مجھے دستِ ظلمت کی بیعت پر تیار کرے
یہ ممکن نہیں۔

نصیر احمد ناصر دہشت گردوں میں بلا عذر مارے جانے والے گم نام اور عام انسانوں کے لئے وقت اور زمانے کے بدلتے ہوئے حالات نئے رخ میں ڈھلتی تاریخ کو گمنامیوں کے صحیفے کا استعارہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ نظم "تاریخ گمنامیوں کا صحیفہ ہے" میں لکھتے ہیں:

تم کو خبر تک نہ ہو گی
کہ تاریخ گمنامیوں کا صحیفہ ہے۔
پڑھتے ہوئے کس کو معلوم ہو گا
کہ کیسے کوئی اپنے اندر کے گہرے گھاؤں،
طلسمی بلاؤں سے لڑ تا رہا ہے
خود اپنی صداؤں سے لڑ تا رہا ہے

مختصراً اگر چند لفظوں میں بات مکمل کی جائے تو یوں کہا جاسکتا ہے کہ دہشت گردی سے متعلقہ نظموں میں تشبیہات و استعارات کا ایک انبار ہے جو شعرا نے اپنے خیالات کو برتنے کے لئے استعمال کئے ہیں۔ جس سے متعلقہ موضوع کو نا صرف جلّا ملتی ہے بلکہ نظم کے حسین پیرائے بھی متاثر کن شکل اختیار کرتے نظر آتے ہیں اور بات دل میں اترتی دکھائی دیتی ہے۔

د۔ ہیئت اور اسلوب کے نئے تجربات

اُن تمام نظموں جن کا براہِ راست یا کسی نہ کسی طور پر حالیہ دہشت گردی اَور اِسی سے متعلقہ واقعات کی مذمت یا نشاندہی سے ملتا ہے کا مطالعہ کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس طرح کی شاعری نے اُردو شاعری کے اسلوب، اسالیب اَور اسلوبیات پر تو اپنا اچھا خاصا تاثر چھوڑا ہے تاہم ہیئت کے حوالے سے کوئی نِت نیا، اچھُوتا، منفرد یا متاثر کُن تجربہ سامنے نہیں لایا جاسکا۔

شعرا نے دہشت گردی اَور اُس سے متعلقہ موضوعات کو زیادہ تر پابند نظموں کی بجائے آزاد اور نثری نظموں کی صورت میں ذریعہء اظہار بنایا ہے۔ شاید اِس کی وجہ اظہارِ آزادی ہو یا خیالات کا فطری بہاؤ جو پابند نظموں میں عموماً اوزان، بحور اَور عرُوض کی قیود سے عموماً ردوبدل کا شکار ہو کر اپنے اصل معانی کھو دینے کا خدشہ بدستور اپنے اندر رکھتا ہے۔ یا اِس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ شعرا حضرات اِس موضوع کو ایک حساس تر

موضوع سمجھتے ہیں اَور اِس کے بیان میں ہیتی تجربے سے مقصداً احتراز برتتے ہیں کہ اس موضوع سے متعلقہ تصورات و خیالات کو من و عن بیان کیا جاسکے تا کہ اِس کی پوری شِدت ،اِس سے متعلقہ مکمل تاثر نظم کے ذریعے تصویر کشی کی صورت شاعری کے صفحات کے کینوس پر اُتارا جاسکے۔

تاہم جہاں تک اسلوب، اسالیب اَور اسلوبیات کا تعلق ہے شعرا حضرات نے دہشت گردی کے جن جن موضوعات کو اپنی نظم میں برتا ہے فِکر سے ہٹ کر؛ زبان و بیاں، ڈکشن یعنی الفاظ کا چناؤ، بنیادی شعری محاسن کے بیان یعنی رمز و اِیمائیت، کنایہ، مراعاۃ النظیر، ذو معنویت ، تشبیہات و استعارات اور تلمیحات کا استعمال، اِس کے علاوہ بدیسی زبانوں کے الفاظ کا استعمال اور انگریزی تراکیب کے برملا اظہار نے اَور بے باکیِ اظہار اور جُرات آموزی میں یا دینی اور مذہبی امثال کے بیان میں؛ ہر طرح کا تجربہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ نظم کبھی افسانہ کی صورت اختیار کرتی نظر آتی ہے تو کہیں یہ قوم کا مرثیہ بن جاتی ہے۔ کبھی یہ نظم دُعائیہ ہو جاتی ہے۔ تو اکثر و بیشتر اس نظم میں واقعاتی اور قِصہ گوئی کا تاثر ملتا ہے۔ لیکن سب سے بڑھ کر یہ کہ تمام نظمیں کسی نوحہ سے کم نہیں جن میں شعرا نے اپنے فن اور اسلوب کے کچھ اس طرح تیر چلائے ہیں کہ پڑھنے والا (قاری) اِس کے گھاؤ میں خود کو خون ریز ہوتا ہوا محسوس کرتا ہے۔

شعرا نے یہ فریضہ بخوبی سرانجام دیا ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری کو اِس گھناؤنے جرم کی چیرہ دستیوں پر خاموشی اختیار کرنے کو جُرم سمجھا ہے اَور اپنی شاعری اور شاعرانہ فن کو اِس مقصدِ خاص کے بیان میں استعمال کیا ہے اور اسلوب کا وہ پیرایہ استعمال کیا ہے جو نئے آنے والے شعرا کے لئے بھی مشعلِ راہ ہے اور ایک عام آدمی کے احساسات کی بھی ترجمانی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر روش ندیم ایسی شاعری کو شاعری ماننے کو تیار ہی نہیں جس میں عام آدمی کے دُکھ، اُن کی خود سوزیاں، بچوں سمیت دریاؤں میں کود جانے والی خود کشیاں اور دہشت گردی کا شکار ہو جانے والوں کے چیتھڑوں کا ذِکر نہ ہو۔ اِس کے برعکس کی جانے والی شاعری کا مُنہ کالا کرنے کی بے باک دھمکی دے کر وہ شاعر کو اپنے اسلوب اور موضوع کو لفظی بازی گری کرنے کی بجائے عام آدمی تک ہی محدود کرنے پر زور دیتے ہیں۔ اپنی نظم "احتجاج کی نئی بوطیقا-2" میں بیان کرتے ہیں:

لعنت ہو تم پر!
تُم سے تو وہ کسان اچھا ہے

جس نے ڈبلیو ٹی او کے اجلاس میں خود کشی کر لی تھی
لیکن تمھیں کیا!
لوگ اپنی ڈگریاں جلائیں
اپنے بچوں سمیت دریاؤں میں کود جائیں
یا بھرے چوک میں خود سوزیاں کریں
تمھیں کیا!
تُم لکھو آفاقیت کی حامل غزلیں، تجرید بھرے افسانے
اَور چھپواتے پھرو لفظی بازی سے مزین نظمیں
تمہارا فیصلہ لکھا جا چکا ہے
مگر تم انجان بن رہے ہو
اب انتظار کرو
جب تمہاری شاعری کا مُنہ کالا کر کے
اِسے گلیوں میں پھرایا جائے گا
تمہارے افسانوں کے چوتڑوں پر دُرے مارے جائیں گے
اور تُمہاری تنقید کو سرِ عام مصلوب کیا جائے گا

صرف یہی نہیں ہر وہ ادیب، شاعر، تنقید نگار، محقق، ناول یا افسانہ نگار جو محض اپنے فن کی آبیاری یا خود سنائی اور خود نمائی کے لئے لکھے گا وہ بقول روش ندیم ادبی دہشت گرد ہو گا۔

کیونکہ اگر شاعر نے منافقت سے کام لے کر حق کا ساتھ نہ دیا اور دہشت وحشت کو خواہ وہ کسی صورت میں ہی ہو ناجائز نہ قرار دیا تو اس کا یہ فعل شاعرانہ دہشت گردی ہو گا۔

غلط! بالکل غلط!
تم کوئی شاعر ادیب نہیں صرف جھوٹے اور خود پرست ہو
تم نت نئے بہانوں سے ادب کی عزت سے کھیلتے آئے ہو
تم جھوٹ بولتے ہو اور ہر روز بولتے ہو
کہ ادب تمہارا اوڑھنا بچھونا ہے
تم ادیب کے روپ میں ڈاکو قاتل، لٹیرے اور دہشت گرد ہو

تم وہی ہو جن کے خلاف ادب صدیوں سے بر سرِ پیکار ہے
تمہیں یاد ہے
جب امریکی فوجیں معصوم جانوں پر یلغار کر رہی تھیں
تو تم حلقہ اربابِ ذوق میں بیٹھے
ادب کی لفظی جمالیات پر بحث کر رہے تھے
جب خود کش حملہ آور لوگوں کو قیمہ بنا رہے تھے
تو تم مقصدیت اور سیاست کو
ادب سے خارج کرنے کی قرار دادیں پاس کروا رہے تھے
لعنت ہو تم پر۔۔۔!

الغرض بدلتے ادوار میں بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں کو اُردو نظم نے بدلتے رویوں اور بدلتے زوایوں سے بخوبی اپنے اَندر سمیٹا ہے۔ نظم کے اسالیب نے جو نئی کروٹیں دہشت گردی سے متعلقہ موضوعات کے آنے سے بدلیں ہیں اِن سے پتہ چلتا ہے کہ اُردو نظم اَب محض روایتی نظم نہیں رہ گئی بلکہ اسلوب اور اندازِ بیاں کے کے اعتبار سے زمانہء موجودہ کی تاریخ بن کر اُبھری ہے جس میں بدلتے حالات سے نبرد آزما ہونے کی پاسداری بھی ہے اور غم زدہ معاشرے کا نوحہ بھی۔

حوالہ جات:

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی،کشاف تنقیدی اصطلاحات، طبع دوم، مقتدر ہ قومی زبان، اسلام آباد،

ص

ایضاً،ص

روش ندیم، دہشت کے موسم میں لکھی نظمیں،ریڈنگ پبلیشرز لاہور، ،ص

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی،کشاف تنقیدی اصطلاحات، طبع دوم، مقتدر ہ قومی زبان، اسلام آباد،

ص

روش ندیم،روزنامہ جناح،اسلام آباد،ادبی اڈیشن، ستمبر ،ص

سید مبارک شاہ، جنگل گماں کے، بک ہوم،لاہور، ،ص

سید مبارک شاہ، ہم اپنی ذات کے کافر، بک ہوم،لاہور، اشاعت سوم، ،ص

8۔ www.facebook.com/sidrasaherimran ، نومبر ،

pm

ایضاً، دسمبر ،

۔ www.facebook.com/naveedmalik ، دسمبر ،

pm

۔ www.facebook.com/ayeshabaigaashi ، اگست ،

pm

۔ www.facebook.com/fakhirabatoolpoetry ، اکتوبر ،

pm

۔ www.facebook.com/ausafsh، اپریل ،pm

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، طبع دوم، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد

ء

۔ احمد ندیم قاسمی، ارض وسما، سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور، ،ص

16۔ امجد اسلام امجد، پھریوں ہوا، جہانگیر بکس، لاہور 2002، ص 90

17۔ ایضاً، ص 87

18۔ کشور ناہید، وحشت اور بارود میں لپٹی ہوئی شاعری، سنگ میل پبلی کیشنز، 2009، لاہور ص 9۔

19۔ ایضاً، ص 22

20۔ ایضاً، ص 58

21۔ ایضاً، ص 12

22۔ سید مبارک شاہ، مدارِ نارسائی میں، اشاعت سوم، بک ہوم لاہور، 2014ء، ص 138

23۔ ایضاً، ص 70

24۔ نصیر احمد ناصر، تیسرے قدم کا خمیازہ، سانجھ پبلی کیشنز، 2013، ص 52

25۔ جواز جعفری، موت کا ہاتھ کلائی پر ہے، فکشن ہاؤس، لاہور، 2005، ص 26

26۔ روش ندیم، دہشت کے موسم میں لکھی نظمیں، ریڈنگ پبلیشرز لاہور، 2015، ص 40

27۔ احمد ندیم قاسمی، ارض و سما، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2007، ص 113

28۔ امجد اسلام امجد، پھریوں ہوا، جہانگیر بکس، 2002، ص 90

29۔ امجد اسلام امجد، یہیں کہیں، جہانگیر بک ڈپو، 2006، ص 131

30۔ کشور ناہید، وحشت اور بارود میں لپٹی ہوئی شاعری، سنگ میل پبلی کیشنز، 2009، لاہور ، ص 105

31۔ جواز جعفری، موت کا ہاتھ کلائی پر ہے، فکشن ہاؤس، لاہور، 2005، ص 22

32۔ سید مبارک شاہ، مدارِ نارسائی میں، اشاعت سوم، بک ہوم لاہور، 2014ء، ص 142۔

33۔ ایضاً، ص 228

34۔ فاخرہ بتول "اسے روکتے بھی تو کس لئے"، ھانی پبلیکیشنز، ملتان 2012، ص 33

35۔ جلیل عالی، عرضِ ہنر سے آگے، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، 2007، ص 86

36۔ نصیر احمد ناصر، ملبے سے ملی چیزیں، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، 2013، ص 86

37۔ روش ندیم، دہشت کے موسم میں لکھی نظمیں، ریڈنگ پبلیشرز لاہور، 2015، ص 39

38۔ ایضاً، ص 40

باب پنجم: محاکمہ

الف: مجموعی جائزہ

یہ ایک حقیقت ہے کہ دہشت گردی نے پاکستانی معاشرے کو ہر حوالے سے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے جہاں جانی اور مالی نقصان ہوا ہے وہاں سماجی و انفرادی سکون بھی اِس دہشت گردی کے ماحول کی نذر ہوا ہے۔ اِس انفرادی بے یقینی، بے سکُونی اَور اِضطرابی کیفیت نے حساس ذہنوں کو بے حد متاثر کیا۔ شاعر جو باریک بین اور حساس ہوتا ہے۔ اسے اِس سارے منظر نامے نے جذباتی اور حِسی طور پر متاثر کیا ہے۔ ایسے میں اُس نے اپنے گرد و پیش میں پھیلی خوف، دہشت اَور بارودی کیفیت کو اپنے خیالات میں یوں عمل انگیزی دِی کہ اُس کی نظموں نے دُکھوں اَور غموں کو امر رنگ پہنا دیئے اَور یُوں ایک نیا تخلیقی معرکہ رُونما ہُوا جِس نے شاعر قبیلے کی موضوعاتی سمت کو نئے زاویے فراہم کیے ہیں۔ جس کا ذکر گزشتہ صفحات میں پیش کی گئی نظموں سے ملتا ہے۔

شاعر اپنے ماحول کی عکاسی اور ترجمانی کرتا ہے۔ دہشت گردی کے تناظر میں منتخب نظموں کے مطالعے سے ایک بات سامنے آتی ہے کہ شاعر اپنے ماحول سے کٹ کر نہیں رہ سکتا۔ وہ سماج میں اپنا سخنورانہ حصہ بھرپور طریقے سے ڈالنا چاہتا ہے اور ڈالتا ہے۔ شاعروں نے اِس دہشت گردی کی لہر کی بھرپور طریقے سے مذمت کرتے ہوئے اپنے شاعرانہ جوہر کا مظاہرہ کیا اَور اپنی شاعری کے ذریعے معاشرے کے ہر فرد کو اِس کے خلاف ڈٹ جانے کی ترغیب دی ہے۔

منتخب شُعرا کے کلام کے مطالعے کے دوران یہ بات مشاہدہ کی گئی ہے کہ حالیہ دہشت گردی کی کارروائیوں نے شعرا کو بالخصوص اَور عوام کو بالعموم جذبہ حُب الوطنی سے سرشار کر دیا۔ شعرا نے اپنی نظموں میں اپنی مٹی سے وفا کے عہد کو نئے سِرے سے باندھ کر اِس مٹی کا حق ادا کرنے کا قَصد اَور پختہ کیا ہے اَور ساتھ ہی ساتھ یہ عزمِ مصمم بھی باندھا ہے کہ خواہ کیسے ہی حالات کیوں نہ ہوں ہم نے اپنی پاک سرزمین کو دُشمنوں اَور دہشت گردوں سے خالی کرا کے اِس پاک دھرتی کو پھر سے "پاک سرزمین" کے معنی پہنانے ہیں۔

شعرا نے اپنی نظموں میں ہر طبقہ زِندگی کے کردار کو سراہتے ہوئے اُن کی بہادری، دلیری اَور جوانمردی کی خُوب داد دِی ہے۔ اِس ضِمن میں شعرا نے عسکری، دفاعی اَور پولیس کے اِداروں کے کردار کی

بھی تعریف کی اَور ساتھ ہی ساتھ اُن کے حوصلے بھی بڑھاتے رہے ہیں تا کہ وہ اپنے فرائض میں مزید بڑھ چڑھ کر چُستی اَور دلجمعی کا مظاہرہ کریں۔ اِس تناظر میں کئی ایک نظمیں عسکری اور دفاعی اِداروں کی خدمات اَور اُن کی ماہرانہ اَور پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کی شان میں بھی لکھی گئی ہیں۔ یہ اِن نظموں کا خاصہ ہے کہ یہ نوجوانوں کا خُون گرمانے اَور اپنی مٹی سے وفا نبھانے پر اُکساتے ہُوئے اُن کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے اُنہیں خراجِ تحسین پیش کرتی ہیں۔

شعرا کی نظموں کے مطالعے سے اَخذ کیا جا سکتا ہے کہ دہشت گردی اَور مذاہب کا آپس میں کوئی تعلق یا واسطہ نہیں ہے دُنیا کا کوئی بھی مذہب ہو وہ امن، اِنسان دوستی اَور محبت کا پرچار کرتا ہے۔ وہ کسی صورت بھی کسی دوسرے شخص کی جان سے نہیں کھیل سکتا۔ شعرا نے اپنی نظموں میں اِس طرح کے موضوعات کو کھُل کر بیان کیا ہے جن میں اُن کا مقصد اِس بات کی تبلیغ تھا کہ مذاہب بھائی چارہ کا دَرس دیتے ہیں، اِنسان دُشمنی کا نہیں۔

شعرا کی تخلیقی کاوشوں کا بغور تنقیدی مطالعہ کرنے سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ اکثر شعرا بین المذاہب ہم آہنگی کے فروغ کے لئے کوشاں نظر آتے ہیں اِن شعرا کے نزدیک بین المذاہب ہم آہنگی سے ہم دہشت گردی اَور ایک دوسرے کے بارے میں منفی رویوں سے بچ سکتے ہیں جس سے آدمیت اَور اِنسانیت کی اعلیٰ قدروں کو پروان چڑھانے اَور آنے والی نسلوں کو بہتر سوچ سمجھ، محبت اَور یگانگت کا عالمی ورثہ منتقل کیا جا سکتا ہے۔ جس سے دُنیا اَمن و امان کا گہوارہ بن کر جنت نظیر بن سکتی ہے۔

دورانِ تحقیق زیرِ مطالعہ آنے والی تصانیف اَور نظموں سے ایک نظریہ بھی اخذ کیا گیا ہے جس کا کم و بیش سب شعرا نے اپنی نظموں میں کسی نہ کسی حوالے سے ذکر ضرور کیا ہے، وہ ہے عدم برداشت۔ معاشرے کے افراد میں برداشت کا مادہ روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے جس کے باعث وہ اپنے نظریات، عقائد، زبان، گروہ، لسانی اور ثقافتی وابستگی کو اِتنا گہرا اَور مضبوط کر لیتے ہیں کہ وہ دیگر تمام نظریات کو حقیر سمجھنے لگتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ دوسروں سے جینے کا حق بھی چھین لینا چاہتے ہیں۔ شعرا نے میرا پیغامِ محبت ہے جہاں تک پہنچے کے مصداق سب کو ایک دوسرے کے عقائد و نظریات کا احترام کرنے کا دَرس دیتے ہوئے ایک دوسرے کے جذبات کی قدر کرنے کی تلقین کی ہے۔

دہشت گردی کی مذمت میں لکھی گئی نظموں کے مطالعے سے ایک بات سامنے آتی ہے کہ شعرا اِس بات کی تکرار کرتے ہوئے مِلتے ہیں کہ وہ جنت جو کسی کے خون سے رنگین ہو وہ دوزخ کے مترادف

ہے۔ نفرت کے نتیجے میں جنّت کا مِلنا محال ہے۔ جنّت ایک جائے محبّت ہے اِس میں کوئی انتشار پسند، نفرت کرنے والا، اِنسانوں کے خون سے ہاتھ رنگنے والا کبھی داخل نہ ہو سکے گا۔ شعرا نے اول الذکر خیال کو رَد کرتے ہوئے اِسکی مخالفت میں قلم اُٹھایا ہے کہ خود کو بم سے اُڑا دینا کہ جس سے دوسروں کی زندگیاں موت کے گھاٹ اُتار دی جائیں تا کہ نتیجتاً اُسے جنت مِلے، ایسا کسی صورت ممکن نہیں۔

دورانِ تحقیق نظموں کے اس مطالعے سے یہ بات بھی عیاں ہوئی ہے کہ شعرا نے بِکھرے ہوئے منتشر معاشرے کو پھر سے اِتحاد اَور یکجہتی کا دَرس دِیا ہے اَور لوگوں کو یہ باور کرایا کہ اِس مُلک میں بسنے والے سب لوگ ایک ہی پاکستان کے شہری ہیں اَور یہی اُن کی پہچان ہے۔ اِس طرزِ تحریر نے لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے اَور باہمی اِختلافات کی فضا کو کم کرنے میں کافی مدد کی اَور دہشت اَور وحشت کے موسم میں لوگوں نے ایک دوسرے پر اعتماد کرنا سیکھا ہے۔

مزید براں، یہ نظمیں ایسے خیالات پیش کر رہی تھیں جن سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ شاعر، خوف، ڈر، بارود، خون، لو تھڑے، دھماکے اَور ان کے مناظر اَور اِس طرح کی خبروں سے نفسیاتی طور پر اِس حد تک زِچ آ چُکا ہے کہ وہ اقرار کرتا ہے کہ اُس کی نظموں کا موضوع بھی اَور مرکزی خیال بھی باہر کے ماحول سے متاثر ہو کر انتشار کا شکار ہے۔ اُسے کوئی تازہ ہوا کا جھونکا کوئی خیر کی خبر کوئی سکون کا لمحہ میسر ہو تو وہ اپنے شعروں میں محبت کے نغمے بکھیرے، اُسے تو چڑیا، فاختہ، پھُول سب جھُلسے ہُوئے مِلتے ہیں۔ وہ کہاں سے گھر، گھروندے، گھونسلے، اَمن اَور خُوشبو کی بات کرے۔ گویا ہم نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ شاعر بھی اپنے اِرد گرد کے ماحول سے مزاحمت کرتے کرتے تھک گیا ہے اَور چاہتا ہے کہ اُسے کوئی مثبت تبدیلی، کوئی بہار کی آمد کی نوید سُنائے کہ اُس کے اشعار خون آمیز رنگ سے نکل کر گلستان کے رنگوں کی بات کر سکیں۔

زیر مطالعہ کئی نظموں کے شعرا نے انتہائی خوبصورتی سے دہشت گردی کو بدترین ماحولیاتی آلودگی قرار دیتے ہوئے دُعا مانگی کہ اِس حبس، نفرت اَور قبر کے ماحول سے چھٹکارا ملے جس میں صوتی آلودگی، بم دھماکوں، چیخ پُکار، ایمبولینس کی آوازوں، پولیس گاڑیوں کے سائرن کی آوازیں حساس ذہن اَور اُس کی سماعتوں کو ناکارہ کرنے کے لیے کافی ہیں اَور پھر بارود، دھُواں، دھُول یہ سب فضائی آلودگی کا باعث بنتے ہوئے کسی دِل پسند منظر کو بھی قیامت خیز منظر بنا دیتے ہیں۔ گویا شعرا نے دہشت گردی کو ماحولیاتی آلودگی سے جوڑ کر اپنے سُخن کو نئے پیرائے میں ڈال کر قاری کو، ہپناٹائز کر لیا ہے۔

کچھ شعرا نے اِس دہشت گردی کے مستقل ماحول پر بڑے خوبصورت انداز سے طنز کے نشتر بھی چلائے ہیں کہ یہ ماحول اَور فضا اِس طرح گزشتہ کُچھ عرصے سے ہماری زِندگیوں اَور معمولات میں داخل ہو چکی ہے کہ اَب ہمیں اِس کی عادت سی ہو گئی ہے اَور جس دِن کوئی اِس سے مِلتی جُلتی خبر یا واقعہ نہ سُن لیں ایسا لگتا ہے جیسے آج کے دِن میں کوئی کمی رہ گئی ہے بلکہ جس طرح لوری کی آواز سے سونے والے بچے اب گولی کی آواز سُن کر سو جاتے ہیں۔ گویا شاعر حضرات اِس سارے دہشت اَور خوف کے مناظر سے اِس قدر مانوس ہو چکے ہیں کہ یہ سب کُچھ اب اُنہیں اجنبی اجنبی نہیں لگتا۔

اس موضوع سے متعلقہ نظموں کے مطالعے سے قاری کو یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ شعرا نے بڑی تلخی سے پاکستان کے تعلیمی ماحول، سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اَور مدرسوں میں بھی ہونے والی دہشت گردی کو اپنی نظموں میں جگہ دی ہے۔ شاعر نے اتنے بڑے دُکھ سے اُن معصوم بچوں کا ذِکر کیا ہے جو گھر سے تعلیم کے حصول کے لئے اپنے بستے، کتابوں، کاپیوں اَور پنسلوں کے ہمراہ نکلے تھے لیکن ظالموں نے اُنہیں بھی نہیں بخشا اَور اُن کے سفید سکول یونیفارم پر جابہ جا سُرخ خون کے دھبے پھیلے ہیں۔ شعرا نے خاص طور پر اِن بچوں پر دہشت گردی کے اقدامات کو اپنی نظموں میں جگہ دی اَور پھر ان بچوں کے حوصلے اَور ہمت کی داد دی کہ اِن مُشکل اَور خوفزدہ کر دینے والے واقعات کے باوجود ہر نئے دِن یہ "شاہین بچے" نئے عزم، نئے ولولے، نئے حوصلے کے ساتھ سکُول کی طرف رواں دواں ہوتے ہیں۔ اَور اُن کے لبوں پر دُعا جاری ہوتی ہے 'دُور دُنیا کا میرے دَم سے اَندھیرا ہو جائے'۔

شعرا نے اپنے کلام میں کئی نئی تراکیب، اصطلاحات کو متعارف کرایا جن کا براہِ راست تعلق اِس دہشت اَور خوف کی فضا سے ہے۔ ایسے میں بم، بارود، وحشت، دھماکہ، سائرن، یونیفارم، وردی، دھواں، خون کے چھینٹے، افراتفری، شور شرابا، ایسے الفاظ جو شاعرانہ خوبصورتی تو نہیں رکھتے لیکن موضوعاتی مجبوری کی صورت شاعر کے کلام میں جگہ پانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ گویا ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ دہشت گردی کے موضوع نے اپنے ساتھ نئی تراکیب، نئی ڈِکشن بھی متعارف کرائی ہے۔

موضوع سے متعلقہ نظموں کا مطالعہ کرتے ہوئے اِس بات کا احساس ہوتا ہے کہ شعرا اِس بات کے قائل نظر آتے ہیں کہ ہمیں اپنے پڑوسی ممالک سے دوستانہ مراسم رکھنے چاہیں اور "اَمن کی آشا" کے فروغ کی کوششیں کرنی چاہیے کیونکہ جب سرحدوں کے دونوں اطراف پر امن و امان ہو گا تو ایسے میں دہشت گردانہ سرگرمیوں کو کہیں سے بھی پشت پناہی نہیں ہو گی تو یہ منفی رجحانات خود بخود دَم توڑ جائیں گے۔

دہشت گردی کے حوالے سے منظرِ عام پر آنے والی نظموں کا ہم مطالعہ اَور تنقیدی جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں طالبنائزیشن، مذہبی جنونیت، انتہا پسندی اَور مذہب جیسے عنوانات کا بار بار سامنا کرنا پڑتا ہے اَور یہ ساری اصطلاحات وہ ہیں جنہیں مغرب نے متعارف کروایا اور پھر یہ اصطلاحات ہمارے ادیبوں اور شعرا نے بھی اپنی تخلیقی کاوش میں استعمال کیں۔

دہشت گردی کے حوالے سے جب نظموں کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہم اِس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ بہت ساری نظمیں واقعاتی اور حادثاتی ہیں۔ ایسی نظمیں کسی واقعے یا حادثے کو بنیاد بنا کر لکھی گئی ہیں۔ جیسے کہ آرمی پبلک سکول پشاور میں پیش آنے والے سانحہ کے حوالے سے لکھی گئی نظمیں۔ اِسی طرح نوجوان طالبعلم اعتزاز کی جرات اَور حوصلہ کو داد دینے کے لئے لکھی گئی نظمیں۔ اِسی طرح کئی ایک نظموں میں مختلف واقعات کو بیانیہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

اِن نظموں کے مطالعے سے ایک اَور زاویہ کی طرف نشاندہی ہوتی ہے کہ اِن نظموں میں بیان کردہ موضوعات نے شاعر کے لئے اپنی چھاپ دوسری اصنافِ ادب اَور دیگر ثانوی موضوعات کی طرف بھی بہت گہری چھوڑی ہے اَور شاعر اِس منظر اَور پسِ منظر سے کُلی جان چھڑانے میں ناکام نظر آتا ہے۔

اِن نظموں میں جذبات نگاری، ماں کی ممتا، دھرتی ماں کے مطالبے کے حوالے بھرپور جذباتی اَور غم و الم میں ڈوبی ہوئی سطور ملتی ہیں۔ دہشت گردی کی نظر ہونے والے کسی شہید کی ماں کا اپنے نوجوان بیٹے کی وردی سے لپٹ کر بین کرنا ہو یا کسی دُکھیاری ماں کے اپنے نونہال کے بستے کو چُوم چُوم کر فریاد کرتے ہوئے اُس کی تحریر دِکھانا اَور اُس کے ہاتھوں کی آڑی ترچھی لکیروں کو فنِ مُصوری کا شاہکار کہنا یقینی طور پر جذبات نگاری کی بلندیوں کو چھُونا ہے۔

اِن نظموں کے مطالعے سے یہ نقطہ نظر بھی سامنے آتا ہے کہ شعرا نے کیسی کیسی جدید اور نادر تشبیہات استعمال کی ہیں۔ یہ تشبیہات زیادہ جذبہ حُب الوطنی کو نمایاں کرتے ہوئے اسلامی تاریخ کے بڑے کرداروں سے مماثلت پیدا کرتے ہُوئے اسلامی تاریخ کے بڑے کرداروں سے مماثلت پیدا کرتے ہُوئے اکثر تلمیحی رنگوں میں بدل جاتی ہیں۔

بعض شعرا کی نظموں میں تنقیدی رنگ بھی چھلکتا ہے اَور اُن کی کچھ لائنوں اَور مصرعوں سے شعوری شکوہ اَور شکایت کا گمان ہوتا ہے جیسے نظم کا مرکزی خیال اِس بات کی نشاندہی کر رہا ہو کہ اِس دہشت گردی کی جنگ سے بہتر منصوبہ بندی اَور سفارتی محاذ کو استعمال کرتے ہوئے بچا بھی جا سکتا تھا۔

بعض شعرا نے اپنی نظموں کو رجز کے انداز میں ترتیب دے کر مصرعوں کو کچھ اِس موضوعاتی انداز میں پیش کیا جس کا مقصد اِس قوم کے ہر فرد کو بلند ہمتی اَور حوصلے سے اِس جنگ کا سامنا کرنے کا حوصلہ دیتا ہے۔ جو سرحدوں پر نہیں بلکہ گلی، کوچوں، بازاروں اَور مذہبی رسوم کے مقامات پر دَر آتی تھی۔

دہشت گردی کے موضوع پر لکھی گئی کئی ایک نظموں کا انداز گیت اَور ترانے جیسا ہے جس سے یہ بات تقویت پاتی ہے کہ شاعر کا مقصد نظموں کو "لَے" میں پڑھ کر دِلوں کو گرمانا ہے۔ گویا یہ رزمیہ شاعری میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔

کچھ نظمیں، ترانے اَور گیت گائے بھی گئے ہیں اَور کچھ عوامی رنگ میں لکھے گئے ہیں جن کی عوام میں بے پناہ مقبولیت نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ شعرا نے شاعرانہ تخیل کو موسیقی کے سنگ نے کیسے اَمر کر دیا ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ دہشت گردی کے موضوع پر لکھی گئی بہت سی نظمیں آزاد ہیں اَور شعرا نے اپنے موضوع سے اِنصاف کرتے ہوئے بڑی پختگی سے آزاد نظم کے کینوس پر ایک تخلیقی کاوش سے ادب کا شاہکار پیش کیا ہے۔ اِس طرح کی نظموں کے مطالعے سے ایک بات کھُل کر سامنے آئی ہے کہ آزاد نظم، مستقبل کی نظمیہ صنف کے طور پر اپنا لوہا منواتی چلی جا رہی ہے اَور زیرِ تحقیق موضوع کی مناسبت سے بھی آزاد نظموں کا ذخیرہ ایسا ہے جن پر یقیناً کوئی بھی صاحبِ ذوق شخص اِترا سکتا ہے۔

دورانِ تحقیق مطالعہ کی گئی نثری نظموں سے یہ تاثر ملتا ہے کہ شعرا نے اِس موضوع کو برتنے کے لئے ہر طرح کی نظموں میں اپنے تخلیقی جوہر کو پیش کیا ہے۔ اِن نظموں میں کچھ مختصر علامتی نظمیں بھی ہیں جبکہ بعض طویل واقعاتی بھی۔

ب: نتائج

- شاعر معاشرے کا حصہ ہے اور ایک حساس نمائندہ ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتا ہے اس کو اپنے خیال کی تخلیقی سان پر چڑھا کر واپس معاشرے کو پیش کر دیتا ہے۔
- جس طرح معاشرے کے دوسرے افراد دہشت گردی اور اس کی کارروائیوں کے خلاف مزاحمت پیش کرتے ہیں، عین اسی طرح شاعر اپنے تخلیقی فن سے ان منفی کارروائیوں کا سدِ باب کرنے کے لئے اصنافِ سخن کا سہارا لے کر امن کے عمل میں اپنا حصہ ڈالتا ہے۔

- شعرا نے نظموں میں تمثیل کو حادثاتی اور واقعاتی منظر کشی سے اس طرح جوڑا ہے کہ ایک سمعی و بصری تاثر پیدا ہوتا ہے۔ جس سے نظم ایک نظمِ تسلسل کی شکل اختیار کر گئی ہے۔
- دہشت گردی کے موضوع سے متعلقہ نظموں کے مطالعے سے یہ احساس اُجاگر ہوتا ہے کہ ان نظموں میں شعری گداز، ترنم اور روانی کا قدرے فقدان ہے۔ اس کی ایک وجہ دراصل موضوع کی نوعیت ہے جسے برتنے میں پھول کی پنکھڑی جیسی ملائمت اور شفافیت کی بجائے بارُود، دھوئیں اور چیخ پکار میں لپٹی فضا کی شمولیت ہے۔
- شعرا نے موضوع کو بہترین انداز میں سخن کے کالم میں ڈھالنے کے لئے بہت ہی عمدہ نئی اور اچھوتی علامات و تراکیب کا استعمال کیا ہے، جس سے ان نظموں کے فنی اور موضوعاتی پہلو کو بہت زیادہ اہمیت مل پائے گی۔

ج: سفارشات

- اِس تحقیق کا دائرہ کار 2000 سے 2017 تک محدود ہے۔ اِس ضِمن میں یہ ایک بڑی کامیابی اَور موضوع کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ کوئی محقق اِس موضوع کو کئی دہائیوں حتیٰ کہ ایک پوری صدی تک پھیلا کر موضوع کو تنوع بخشے۔
- موجودہ مقالے کو چونکہ صرف نظم تک محدود رکھا گیا ہے اِس لئے یہ نقطہ بھی سفارشات میں شامل کیا جا سکتا ہے کہ موضوع کے دامن کو مزید وسیع کرتے ہُوئے اِس میں شاعری کی تمام اصناف کو شامل کر کے تحقیق کی جائے۔
- اِس مقالے میں چونکہ صرف اُردو زبان و ادب کے حوالے سے نظمیں شامل کی گئی ہیں اِس لحاظ سے نئے تحقیق کاروں کے لئے ایک موقع ہے کہ وہ اِس موضوع کو مختلف پاکستانی زبانوں تک پھیلا کر اپنے مقالے کو پیش کر سکتے ہیں اور اس میں وسعت پیدا کر سکتے ہیں۔
- مستقبل کے محقق کے لئے یہ بھی چیلنج ہو سکتا ہے کہ وہ صرف تمثیلات، تلمیحات، اَور تراکیب کے تناظر میں اپنا تحقیقی عمل شروع کرے اَور اِس موضوع کے حوالے سے اپنا تحقیقی مقالہ پیش کرے۔
- یہ سفارش بھی پیش کی جا سکتی ہے کہ تحقیقی عمل کو نثری کاوشوں اور نثری اصناف کے تناظر میں زیر مطالعہ لا کر ایک جامع تحقیقی کام سامنے لایا جائے۔

- دہشت گردی کی لہر نے ہمارے تعلیمی اِداروں کو خاص طور پر نشانہ بنایا۔ اِس ضِمن میں ایک ایسا تحقیقی مقالہ بھی پیش کیا جاسکتا ہے جس میں تعلیمی ماحول پر دہشت گردی کے اثرات کا مطالعہ کیا جائے۔

کتابیات

بنیادی ماخذ:

- احمد ندیم قاسمی، ارض و سما، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور،
- امجد اسلام امجد، یہیں کہیں، جہانگیر بک ڈپو، لاہور،
- امجد اسلام امجد، پھر یوں ہوا، جہانگیر بک ڈپو، لاہور،
- ارشد معراج، کتھا نیلے پانی کی، بہزاد پبلیشرز، راولپنڈی،
- تنویر دانش، درد کے خواب انوکھے، رومیل ہاؤس آف پبلیشرز، راولپنڈی،
- جلیل عالی، عرضِ ہنر سے آگے، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد،
- جواز جعفری، موت کا ہاتھ کلائی پر ہے، فکشن ہاؤس، لاہور،
- روش ندیم، دہشت کے موسم میں لکھی ہوئی نظمیں، ریڈنگ پبلیشرز، لاہور،
- سید مبارک شاہ، جنگل گماں کے، بک ہوم لاہور،
- سید مبارک شاہ، مدارِ نارسائی میں، اشاعت سوم، بک ہوم، لاہور،
- سید مبارک شاہ، ہم اپنی ذات کے کافر، اشاعت ہوم، بک ہوم، لاہور،
- طلعت اخلاق احمد، گمشدہ سر، کینوس کمیونی کیشنز، کراچی،
- علی محمد فرشی، زندگی خودکشی کا مقدمہ نہیں، سمبل مطبوعات، راولپنڈی،
- فاخرہ بتول، اسے روکتے بھی تو کس لئے، ھانی پبلی کیشنز، ملتان
- کشور ناہید، وحشت اور بارود میں لپٹی ہوئی شاعری، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور،
- نصیر احمد ناصر، تیسرے قدم کا خمیازہ، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور،
- نصیر احمد ناصر، ملبے سے ملی چیزیں، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور،

ثانوی ماخذ

- ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات طبع دوم، مقتدر، قومی زبان، اسلام آباد،

- اعجاز ملک، پاکستان میں شناخت کا بحران، دستک پبلی کیشنز، ملتان،
- الیاس میراں پوری، جدید شعری روایات، بیکن بکس، لاہور،
- تصدق حسین راجہ، اسلام اور دہشت گردی، فن پبلی کیشنز، اسلام آباد،
- جیفری ایم لیوٹ، دہشت گردی کے خلاف جمہوری ممالک، عرفان امتیازی مترجم، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی،
- حق حقی، ڈاکٹر، ہوئے تم دوست جس کے، شفیق پبلی کیشنز، لاہور،
- زاہد حسن، شدت پسندی چند اہم فکری زاویے، شرکت پریس، لاہور،
- سلمان عابد، دہشت گردی ایک فطری مطالعہ، جمہوری پبلی کیشنز، لاہور،
- سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی اصطلاحات: تنقیدی لغت، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور،
- سہیل احمد، پاکستانی زبان و ادب پر / کے اثرات، مرتبہ، ادارہ ادبیات اردو، جامعہ پشاور،
- سیموئیل پی ہنٹنگٹن، تہذیبوں کا تصادم، محمد احسن بٹ، مترجم، مثال پبلشنگ لاہور،
- ضیا الحسن، ڈاکٹر، جدید اُردو نظم کا آغاز و ارتقا، بیکن بکس، لاہور،
- طارق ہاشمی، اُردو نظم اور معاصر انساں، یورپ اکادمی، اسلام آباد،
- مصطفیٰ اکیول، اسلام شدت پسندی کے بغیر، مقبول الٰہی، پروفیسر، مترجم، مشعل بکس، لاہور،
- ناوم چومسکی، دنیا کی بے اطمینانی، فرنٹ لائن، دہلی، انڈیا،
- وزیر آغا، نظم جدید کی کروٹیں، سنگت پبلیشرز، لاہور،

رسائل

- ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ کراچی، شمارہ فروری
- ماہنامہ بیاض، لاہور، شمارہ مئی ، شمارہ اگست،
- سہ ماہی تجزیات، اسلام آباد، شمارہ اکتوبر–دسمبر
- دنیازاد، کراچی، شمارہ ،

- ماہنامہ روحانی ڈائجسٹ، کراچی، شمارہ ستمبر 2005
- ماہنامہ شام و سحر، لاہور، شمارہ اگست 2008
- سہ ماہی عطا، ڈیرہ اسماعیل خان، شمارہ جون 2010
- ماہنامہ حلال، راولپنڈی، شمارہ 6، 2016، شمارہ 12، 2016، شمارہ 2، شمارہ 2، 2017، شمارہ 6، 2017

لغات / انسائیکلوپیڈیا

- آکسفورڈ انگلش ڈکشنری آف ہسٹاریکل پرنسپلز، والیم 11، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، لندن، یو کے، 1998
- آکسفورڈ انسائیکلوپیڈیا آف دی ماڈرن اسلامک ورلڈ، جلد 4، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، لندن، یو کے، 1995
- آکسفورڈ کونسائز ڈکشنری آف پالیٹکس، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، لندن، یو کے، 1996
- اردو انسائیکلوپیڈیا، فیروز سنز لمٹیڈ، لاہور، 2005
- انسائیکلوپیڈیا آف امریکانا، والیم 62، ڈنبرے لائبریری پریس، یو ایس اے، 2001
- فیروز اللغات، اردو جامع، فیروز سنز لمٹیڈ، لاہور، س ن
- ورلڈ انسائیکلوپیڈیا، پیراگون ہاؤس پبلیشرز، لندن، یو کے، س ن
- ویب سٹر زنیو کالج ڈکشنری، چوتھا ایڈیشن، ایمرلڈ گروپ پبلشنگ لمٹیڈ، انڈیانا، یو۔ایس۔اے۔ 2005

اخبارات

- روزنامہ ایکسپریس اسلام آباد، 03 جنوری 2016، 23 مارچ 2016، 1 فروری 2017، 25 جولائی 2017

- روزنامہ پاکستان، لاہور، جون
- روزنامہ جناح، اسلام آباد، ستمبر
- روزنامہ جنگ راولپنڈی، اگست

انٹرنیٹ/ویب سائٹس

- www.dawnnews.com/international
- http://play.google.com/store/apps
- www.facebook.com
- http://universalurdupost.com/poetry
- www.wikipedia.org/wiki/D8
- www.youtube.com